ادارہ تحقیق و تصنیفِ اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ
۲۰۲۰۰۱

ادارۂ تحقیق و تصنیفِ اسلامی کا سہ ماہی ترجمان

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

اکتوبر ــــــــــــ دسمبر ۱۹۹۴ء

—: ایڈیٹر :—

سیّد جلال الدّین عمری

پان والی کوٹھی دودھپور علی گڑھ
۲۰۲۰۰۱

سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ

جلد ۱۳ — شمارہ ۴

اکتوبر ——— دسمبر ۱۹۹۴ء

جمادی الاول ——— رجب المرجب ۱۴۱۵ھ

سالانہ زرتعاون

ہندوستان سے ——— ۵۵ روپے

پاکستان سے ——— ۱۲۰ روپے

دیگر ممالک سے ——— ۲۰ ڈالر

فی شمارہ ——— ۱۵ روپے

طابع وناشر سید جلال الدین عمری نے انٹرنیشنل پرنٹنگ پریس علی گڑھ کے لیے ناز پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی، پان والی کوٹھی دودھ پور علی گڑھ سے شائع کیا

فہرست مضامین

حرف آغاز

سلام کی اہمیت اور غیر مسلم کو سلام کا حکم — سید جلال الدین عمری — ۵

تحقیق وتنقید

برطانوی راج کے خلاف مسلمانان ہند کی سیاسی اور علمی جدوجہد — ڈاکٹر اقبال حسین — ۲۹

مسلمانان بنی اسرائیل دہلی سلطنت کے عہد میں — پروفیسر اقتدار حسین صدیقی — ۵۷

بحث ونظر

ہند اسلامی تہذیب اور تصوف — ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی — ۷۵

سیر وسوانح

امام ابوالمظفر سمعانی۔حیات وخدمات — محمد ثناء اللہ بھٹو — ۹۶

مترجم مولانا جرجیس کریمی

خبرنامہ ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ — ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی — ۱۱۴

فہرست مضامین تحقیقات اسلامی ۱۹۹۴ء — ۱۱۸

اس شمارہ کے لکھنے والے

۱۔ ڈاکٹر اقبال حسین

ریڈر شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۲۔ پروفیسر اقتدار حسین صدیقی

صدر شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۳۔ ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی

ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۴۔ مولانا محمد جرجیس کریمی

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

۵۔ ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

۶۔ مولانا سید جلال الدین عمری

سکریٹری ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

:خوش نویس:

احرازالحسن

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ آغاز

سلام کی اہمیت اور غیر مسلم کو سلام کا حکم

سید جلال الدین عمری

سلام ۔ اسلامی تہذیب کا نشان

ایک انسان دوسرے انسان سے ملاقات کے وقت مسرت، خوشی اور تعلق خاطر محسوس کرتا ہے تو مختلف طریقوں سے اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ اس کے لیے ہر قوم میں مخصوص الفاظ اور کلمات بھی رائج ہیں۔ ان کا تعلق مذہب، سماج، معاشرتی روایات اور رسوم ورواج سے ہوتا ہے۔ اس لیے اسے تہذیب اور کلچر کا ایک اہم حصہ سمجھا جاتا ہے۔ اسلامی تہذیب یہ ہے کہ 'السلام علیکم' کے الفاظ کے ساتھ ملاقات کی جائے اس میں 'رحمۃ اللہ وبرکاتہ' کا اضافہ بھی پسندیدہ سمجھا گیا ہے۔ اسی کو اصطلاح میں سلام کہا جاتا ہے۔

قرآن مجید میں لفظ سلام کے استعمالات

سلام کا لفظ قرآن مجید میں جن مواقع پر آیا ہے ان میں سے بعض یہ ہیں :۔

۱۔ امن وسلامتی کا وہ پیغام اور خوش خبری جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے نیک بندوں کو ملتی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

سَلَامٌ عَلٰی عِبَادِهِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی (النمل : ۵۹)	سلام ہے اس کے ان بندوں پر جن کو اس نے منتخب کیا۔

دوسری جگہ فرمایا :۔

سَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ (صافات : ۱۸۱)	سلام ہے اللہ کے رسولوں پر۔

ان عمومی بیانات کے ساتھ سورۂ صافات میں بعض پیغمبروں کا نام لے کر ان پر سلام بھیجا گیا ہے۔

سَلَامٌ عَلٰی نُوْحٍ فِی الْعَالَمِیْنَ (۷۹)	سلام ہے نوح پر سارے جہاں والوں میں
سَلَامٌ عَلٰی اِبْرَاهِیْمَ (۱۰۹)	سلام ہے ابراہیم پر
سَلَامٌ عَلٰی مُوْسٰی وَهَارُوْنَ (۱۲۰)	سلام ہے موسیٰ اور ہارون پر
سَلَامٌ عَلٰی اٰلِ یَاسِیْنَ (۱۳۰)	سلام ہے الیاس پر

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے ان نیک بندوں کے لیے امن وسلامتی کی بشارت ہے۔

۲۔ جنت میں اہل جنت کو خدا کی طرف سے سلام نصیب ہوگا۔

سَلَامٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِیْمٍ ○ (یٰسین : ۵۸)	سلام کہا جائے گا انھیں رب رحیم کی طرف سے۔

۳۔ حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں ارشاد ہے:۔

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِیْمَ بِالْبُشْرٰی قَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ (ہود: ۶۹)	ہمارے فرستادے (فرشتے) ابراہیمؑ کے پاس (حضرت اسمٰعیلؑ کی) خوش خبری لے کر پہونچے انھوں نے ابراہیمؑ کو سلام کہا اور انھوں نے بھی جواب میں سلام کہا۔

یہ مضمون سورۂ ذاریات میں بھی آیا ہے (۲۵) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے پیغمبروں کو فرشتے سلام کرتے ہیں اور پیغمبر اس کا جواب دیتے ہیں۔ (بکثرت احادیث سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے)

۴۔ اللہ کے نیک بندوں کا جنت میں فرشتے سلام کے ذریعہ استقبال کریں گے۔ (النحل: ۳۲) وہ ہر طرف سے انھیں سلام کریں گے (الرعد: ۲۴) اہل جنت سلام کے ساتھ جنت میں داخل ہوں گے۔ (الحجر: ۴۶) خود اہل جنت بھی ایک دوسرے کو سلام کریں گے۔ (یونس: ۱۰)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے نیک بندوں کو اس کی طرف سے سلام کی سوغات ملتی رہتی ہے۔ فرشتے، پیغمبر اور اہل جنت ایک دوسرے کو سلام کرتے ہیں۔ اس طرح سلام محض ایک تہذیبی روایت یا معاشرتی طریقہ ہی نہیں بلکہ اس میں پاکیزگی، تقدس اور عظمت کے معانی پنہاں ہیں[1]

---

[1] 'سلام' جاہلوں سے اعراض کا ایک مہذب اور شریفانہ طریقہ بھی ہے۔ قرآن مجید کی ہدایت ہے:۔

فاصفح عنہم وقل سلام فسوف یعلمون۔ (الزخرف: ۸۹)	پس ان سے درگزر کرو اور کہو سلام ہے۔ جلد ہی انھیں معلوم ہو جائے گا۔

=

سلام کا معنی و مفہوم

سلام میں ہر طرح کے نقص اور عیب سے پاک ہونے کا تصور ہے۔ اسی پہلو سے اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک "السلام" بھی ہے (الحشر: ۲۳) اس لیے کہ اس کی ذات بے عیب اور ان تمام کمزوریوں اور خامیوں سے مبرّا اور منزّہ ہے جو مخلوق میں پائی جاتی ہیں۔ سلم کا لفظ حرب کا ضد ہے جس کے معنی جنگ کے ہیں۔ اس طرح سلم میں نجات اور سلامتی، امن وصلح اور اذیت سے محفوظ رہنے کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ اس میں دعا کے معنی بھی موجود ہیں۔ "السلام علیکم" کے کلمات سے ملاقات کے آغاز کا مطلب یہ ہے کہ یہ ملاقات اس خدا کے نام سے ہو رہی ہے جو انسان کے ظاہر و باطن، اس کے خیالات و عزائم اور اعمال و افعال سے واقف ہے۔ تمہیں مجھ سے خوف اور اندیشہ محسوس کرنے کی ضرورت نہیں، تمہیں میری ذات سے کوئی تکلیف اور گزند نہیں پہونچے گی[1]۔

سلام کو عام کرنے کا حکم

بکثرت احادیث میں سلام کو عام کرنے کا حکم ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

اعبدوا الرحمٰن واطعموا　　رحمٰن کی بندگی کرو (بھوکوں کو) کھانا کھلاؤ

---

[1] اہلِ کتاب کے نیک اور صالح افراد کے بارے میں ارشاد ہوا۔

وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا	جب وہ لغو بات سنتے ہیں تو اس سے اعراض کرتے ہیں
لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ	اور کہتے ہیں ہم اپنے اعمال کے ذمہ دار ہیں اور تم اپنے
لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ۔ (القصص: ۵۵)	اعمال کے۔ تم کو سلام ہے۔ ہم جاہلوں کو نہیں چاہتے

اہلِ ایمان کی خوبی یہ بیان ہوئی ہے۔ اذا خاطبہم الجاھلون قالوا سلاما (الفرقان: ۶۳) جب ان سے جاہل الجھتے ہیں تو وہ کہتے ہیں تمہیں سلام ہے۔

یہ سلامتی اور رحمت کی دعا کا سلام نہیں بلکہ بے تعلقی اور علاحدگی کا سلام ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کو جب ان کے باپ آذر نے سنگسار کرنے کی دھمکی دی تو انھوں نے فرمایا۔ سَلٰمٌ عَلَيْكَ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا۔ (مریم: ۴۷) سلام ہے آپ کو میں اپنے رب سے آپ کے لیے مغفرت کی دعا کروں گا۔ بے شک وہ مجھ پر مہربان ہے۔

یہ سلام اظہارِ برأت کے لیے تھا۔ اس طرح کے سلام کے لیے ہر زبان میں مناسب الفاظ موجود ہیں۔ ایسے موقع پر ہماری زبان میں =

الطعام وافشوا السلام	اور سلام کو عام کرو جنت میں سلامتی کے
تدخلوا الجنة بسلام [1]	ساتھ داخل ہو جاؤ گے۔

حضرت عبداللہ بن سلامؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل فرماتے ہیں۔

ایها الناس افشوا السلام	اے لوگو! سلام کو عام کرو (بھوکوں
واطعموا الطعام وصلوا بالليل	کو) کھانا کھلاؤ اور رات میں جب لوگ
والناس نيام تدخلوا الجنة	سو رہے ہوں نماز پڑھو جنت میں سلامتی
بسلام [2]	کے ساتھ داخل ہو جاؤ گے۔

سلام مسلمانوں کے لیے ہے

یہ اور اس نوعیت کی دیگر احادیث[3] کے سلسلہ میں ایک سوال یہ ابھرتا ہے کہ کیا ان کا تعلق صرف مسلمانوں سے ہے یا یہ مسلم اور غیر مسلم سب کے لیے عام ہیں۔ زیادہ تر علماء کی رائے یہ ہے کہ ان کے مخاطب مسلمان ہیں۔ انھیں آپس کے تعلقات میں جن باتوں کی ہدایت کی گئی ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ ملاقات کے وقت سلام کریں۔ بعض احادیث سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

لا تدخلوا الجنة حتى	تم جنت میں نہیں داخل ہو گے تا آنکہ
تؤمنوا ولا تؤمنوا حتى	ایمان نہ لاؤ گے اور ایمان (کامل) نہ لاؤ گے
تحابوا. اولا ادلكم	جب تک کہ آپس میں محبت نہ کرو۔ کیا میں
على شيئ اذا فعلتموه	تمہیں ایسی چیز نہ بتاؤں کہ اس پر عمل کرو
تحاببتم افشوا السلام	تو ایک دوسرے سے محبت کرنے لگو؟

۔ کہا جاتا ہے بمعاف کیجیے ہم سلام کرتے ہیں۔ اس کے لیے السلام علیکم کے مسنون الفاظ استعمال نہیں ہوتے۔

[1] (صفحہ ۷ کا حاشیہ) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راغب، مفردات القرآن، مادہ سلم ص ۲۳۹ - ۲۴۱۔ ابن اثیر، النہایہ فی غریب الحدیث: ۲/۱۶۲ - ۱۶۸۔ ابن حجر، فتح الباری: ۱۱/۱۳۔

[1] ترمذی، ابواب الاطعمہ، باب ماجاء فی فضل اطعام الطعام۔ [2] ترمذی، ابواب صفۃ القیامۃ، باب....

[3] اس سلسلہ کی بعض اور روایات اور ان کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو راقم کا مضمون "کم زور — اسلام کے سایہ میں"، مطبوعہ ماہنامہ زندگی۔ اگست، ستمبر ۱۹۷۵ء۔

بینکم [1]	وہ یہ ہے کہ اپنے درمیان سلام کو عام کرو۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ مسلمانوں کے درمیان سلام کا زیادہ سے زیادہ رواج ہونا چاہیے۔ اس سے اجنبیت اور دوری ختم ہو گی محبت بڑھے گی اور تعلقات مضبوط ہوں گے۔ اس سے علامہ قرطبی نے حسب ذیل استدلال کیا ہے۔

ھذا یقتضی افشاء ہ	یہ حدیث تقاضا کرتی ہے کہ سلام کو
بین المسلمین دون	مسلمانوں کے درمیان پھیلایا جائے
المشرکین [2]	نہ کہ مشرکین کے درمیان۔

اس مفہوم کی ایک اور روایت حضرت انسؓ سے مروی ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

ان السلام اسم من اسماء	بے شک سلام اللہ تعالیٰ کے اسماء میں
اللہ تعالیٰ وضعہ اللہ فی الارض	سے ایک ہے جسے اس نے زمین پر نازل
فافشوا السلام بینکم [3]	فرمایا ہے لہٰذا تم اسے اپنے درمیان عام کرو۔

ایک روایت میں شناسا، غیر شناسا یا واقف ناواقف ہر ایک کو سلام کا حکم ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا 'ای الاسلام خیر' (بہترین اسلام کیا ہے؟) مطلب یہ کہ اسلام کا بہترین اظہار کن صفات کی شکل میں ہوتا ہے۔ آپ نے فرمایا:۔

تطعم الطعام وتقرأ	یہ کہ تم (بھوکے کو) کھانا کھلاؤ اور جسے
السلام علی من عرفت	جانتے ہو اور جسے نہیں جانتے ہر ایک
ومن لم تعرف [4]	کو سلام کرو۔

---

[1] مسلم، کتاب الایمان، باب بیان انہ لا یدخل الجنۃ الا المؤمنون الخ۔ ابوداؤد، کتاب السلام، باب افشاء السلام۔ ترمذی، ابواب الاستیذان، باب ما جاء فی افشاء السلام۔

[2] قرطبی: الجامع لاحکام القرآن: ۵/۳۰۲۔

[3] الادب المفرد: ۲/۴۴۹ قال الحافظ سندہ حسن واخرجہ البزار والطبرانی من حدیث ابن مسعود مرفوعا وموقوفاً فتح الباری: ۱۱/۱۳۔

[4] بخاری، کتاب الایمان، باب اطعام الطعام من الاسلام۔ مسلم، کتاب الایمان، باب بیان تفاضل الاسلام وای الاسلام خیر۔

اس حدیث کے ذیل میں امام نووی فرماتے ہیں :۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ صرف ان ہی لوگوں کو سلام نہ کرو جن سے تمہاری واقفیت ہے، جیسا کہ بہت سے لوگ کرتے ہیں۔ (بلکہ ہر ایک کو سلام کرو) لیکن یہ حکم مسلمانوں کے لیے ہے۔ غیر مسلم کو سلام کرنے میں پہل نہیں کی جائے گی۔[۱]

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں نے اس حدیث سے یہ استدلال کیا ہے کہ غیر مسلم کو بھی سلام کیا جا سکتا ہے (اس لیے کہ سلام کو عام کرنے کا حکم ہے) لیکن حدیث میں اس کی دلیل نہیں ہے، اس لیے کہ سلام اصلاً مسلمانوں کے لیے مشروع ہے۔ حدیث کا تعلق ان ہی سے ہے۔ 'من عرفت' (جس سے تم واقف ہو) سے مراد مسلمان ہے۔ 'من لم تعرف' (جس سے تم واقف نہ ہو) اس کی دو شکلیں ہیں۔ ایک یہ کہ عدم واقفیت کے باوجود اگر وہ مسلمان ہے تو اسے سلام کرنے میں پیش قدمی کی جائے گی، لیکن اگر اس کے مسلمان ہونے کا علم نہیں ہے تو احتیاطاً سلام کیا جائے گا جب تک کہ یہ بات معلوم نہ ہو جائے کہ وہ غیر مسلم ہے۔[۲]

یہی بات علامہ عینی نے بھی کہی ہے۔

حدیث میں سلام کو عام کرنے کا اشارہ ہے لیکن اس میں جو عموم ہے وہ مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہے (دوسرے لفظوں میں حدیث کا منشا یہ ہے کہ سلام کو صرف مسلمانوں کے درمیان عام کیا جائے) کافر کو سلام کرنے میں پہل نہیں کی جائے گی۔[۳]

غیر مسلموں کو سلام کرنے کی ممانعت

مسلمانوں کے درمیان سلام کو عام کرنے کے حکم سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کسی غیر مسلم کو سلام نہیں کیا جا سکتا۔ اس نقطۂ نظر کی اصل دلیل حضرت ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

---

[۱] نووی: شرح مسلم ج ا جزء ۲ ص ۱۰۔

[۲] فتح الباری: ۱۱/۲۱

[۳] عینی، عمدۃ القاری: ۱/۱۵۶

لاتبدؤا الیھود والنصاریٰ	یہود و نصاریٰ کو سلام کا آغاز تمہاری
بالسلام فاذا لقیتم احدھم	طرف سے نہ ہو ان میں سے کسی سے
فی طریق فاضطروہ الی اضیقہ[1]	راستہ میں تمہاری ملاقات ہو جائے تو
	اسے اس کے تنگ حصہ میں چلنے پر مجبور کرو۔

اس سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ یہود و نصاریٰ کو سلام کرنے میں پیش قدمی نہیں کی جائے گی اور انھیں راستہ کے کنارے چلنے پر مجبور کیا جائے گا۔[2]

ممانعت کی نوعیت

سوال یہ ہے کہ یہ حکم کیا مستقل نوعیت کا ہے یا اس وقت کے مخصوص حالات کے تحت دیا گیا ہے۔ رسول اللہؐ کے مدینہ منورہ پہونچنے کے فوراً بعد یہود کے ساتھ امن و امان، مذہبی آزادی اور باہمی تعاون کا معاہدہ ہوا[3] لیکن انھوں نے کبھی اس کی پاس داری نہ کی۔ اسلام دشمنی، سازشیں اور خیانتیں روز بروز بڑھتی ہی چلی جارہی تھیں۔ سلام و کلام میں ان کے غیر شریفانہ رویہ کا ذکر آگے آرہا ہے۔ ان کی ان تمام حرکتوں کے باوجود قرآن نے درگذر کا حکم دیا (البقرہ: ۱۰۹) جب یہ سازشیں آخری حد کو پہونچ گئیں تو ان سے جنگ بھی ہوئی اور انھیں جلاوطن بھی کیا گیا۔ (الحشر: ۱-۵) اس طرح حالات کے لحاظ سے ان کے سلسلہ میں اسلام کے رویہ میں تبدیلی آتی رہی ہے۔

---

[1] مسلم، کتاب السلام، باب النہی عن اہل الکتاب بالسلام۔ ترمذی، ابواب الاستیذان، باب ماجاء فی کراہیۃ التسلیم علی الذمی۔ ابوداؤد، کتاب السلام، باب فی السلام علی اہل الذمہ، مسند احمد: ۱۹/۴۷، حدیث نمبر ۹۹۲۱ مسند کی ایک روایت میں یہود کی جگہ مشرکین کا لفظ آیا ہے ۱۹/۱۵ احدیث نمبر ۹۷۲۴۔

[2] راستہ سے متعلق اس ہدایت کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ انھیں راستہ سے دھکا دے کر کنارے کر دیا جائے تاکہ وہ آسانی سے نہ چل سکیں بلکہ بھیڑ بھاڑ اور ازدحام ہو تو ان کے احترام میں خود کنارے ہو کر انھیں درمیانی راستہ نہ دیا جائے بلکہ اسی زحمت اور تنگی سے گزرنے دیا جائے۔ اگر راستہ کشادہ ہو اور کسی کے گزرنے میں کوئی زحمت نہ ہو تو وہ سب کے ساتھ چل سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں انھیں کنارے چلنے کا پابند بنانا بلاوجہ کی اذیت رسانی ہے جس کی شریعت نے اجازت نہیں دی ہے۔ فتح الباری: ۱۱/۴

[3] معاہدہ کی تفصیل کے لیے دیکھی جائے۔ ابن ہشام: سیرۃ النبیؐ ۲/۱۱۹-۱۲۳

ہوسکتا ہے کہ سلام میں پیش قدمی نہ کرنے اور راستہ میں ان کا احترام نہ کرنے کی ہدایت اسی طرح کے حالات میں دی گئی ہو۔ ظاہر ہے حالات کے بدل جانے کے بعد حکم بھی بدل جائے گا۔ اس کی تائید بعض صحابہ و تابعین کے عمل سے ہوتی ہے۔

غیر مسلم کو سلام کرنے کا ثبوت

روایت ہے کہ حضرت ابو امامہؓ کا راستہ چلتے ہوئے مسلمان، نصرانی، چھوٹے یا بڑے جس کسی کے پاس سے بھی گزر ہوتا سلام کرتے۔ جب ان سے اس سلسلہ میں دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ ہمیں سلام کے عام کرنے اور پھیلانے کا حکم ہے۔[1]

بیہقی کی روایت میں ہے کہ حضرت ابو امامہؓ نے فرمایا کہ یہ مسلمانوں کے لیے برکت کی دعا اور ذمیوں کے لیے امن و امان کا اظہار ہے۔[2]

امام ابن جریر طبری کہتے ہیں کہ سلف سے مروی ہے کہ وہ اہلِ کتاب کو سلام کیا کرتے تھے۔[3]

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ، ابو درداءؓ اور فضالہ بن عبیدؓ کے متعلق آتا ہے کہ وہ اہل کتاب کو سلام کرنے میں پہل کرتے تھے۔[4]

عون بن عبد اللہؒ کہتے ہیں کہ محمد بن کعب قرظی نے بیان کیا کہ انھوں نے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ سے دریافت کیا کہ ذمیوں کو سلام کرنے میں پیش قدمی کی جا سکتی ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہماری طرف سے سلام کی ابتدا صحیح نہیں ہے البتہ ان کے سلام کا جواب دیا جائے گا۔ عون بن عبد اللہ نے اس مسئلہ میں خود محمد بن کعب قرظی کی رائے دریافت کی تو انھوں نے کہا کہ انھیں آگے بڑھ کر سلام کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔[5]

---

[1] قال الحافظ اخرجہ الطبری بسند جید۔ فتح الباری : ۱۱/۴۱۔

[2] ابن حجر، فتح الباری: ۱۱/ ۳۹۔ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن : ۱۱/۱۱۲۔

[3] قرطبی، الجامع لاحکام القرآن : ۱۱/۱۱۲۔

[4] عینی، عمدۃ القاری : ۱۲/ ۱۹۔

[5] ابن حجر، فتح الباری : ۱۱/۳۹۔

امام اوزاعی سے سوال کیا گیا کہ ایک مسلمان کسی غیر مسلم کے پاس سے گزرتے وقت اسے سلام کر سکتا ہے؟ انھوں نے جواب دیا اگر تم نے سلام کیا تو اس سے پہلے صالحین نے سلام کیا ہے اور اگر تم نے سلام نہیں کیا تو صالحین نے سلام نہیں بھی کیا ہے۔ (یعنی سلف سے دونوں طرح کے عمل منقول ہیں[۱])

سماجی تقاضوں کے تحت غیر مسلم کو سلام کا جواز

ایک خیال یہ ہے کہ مسلمانوں کے درمیان تو سلام کو ہر موقع اور ملاقات پر عام کرنے کا حکم ہے، غیر مسلموں کے بارے میں اس طرح کی ہدایت نہیں ہے، البتہ سماجی ضروریات اس کا تقاضا کر رہی ہوں تو انھیں سلام کیا جا سکتا ہے۔

حضرت علقمہؒ کہتے ہیں کہ ہم لوگ حضرت عبداللہ بن مسعود کے ساتھ ایک سفر میں تھے۔ کچھ دہقان (ذمی) بھی شریک سفر تھے۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد ان کا راستہ الگ ہو گیا اور وہ اس پر چلنے لگے تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے انھیں سلام کیا۔ میں نے عرض کیا کہ ذمیوں کو سلام کرنا کیا ناپسندیدہ نہیں ہے؟ حضرت عبداللہ بن مسعود نے جواب دیا کہ یہ تو حقِ صحبت ہے[۲]

بعض فقہاء کی رائے یہ ہے کہ مسلمان کا اپنی کسی حاجت اور ضرورت کے تحت غیر مسلم کو سلام کرنا جائز ہے۔ قاضی عیاض کے بقول یہ حضرت علقمہ اور امام نخعی کا قول ہے[۳]

---

[۱] قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۱۱/۱۱۲۔ نووی، شرح مسلم ج ۵ جز ۱۴ ص ۱۴۵۔

[۲] قال الحافظ اخرجہ الطبری بسند صحیح، فتح الباری ۱۱/۴۱۔ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۱۱/ ۱۱۲۔ مصنف عبدالرزاق کی روایت میں علقمہ کے سوال اور حضرت عبداللہ بن مسعود کے جواب کا ذکر نہیں ہے۔ ۶/ ۱۲۔ امام محمد کی روایت ہے کہ ایک ذمی نے جو حضرت عبداللہ بن مسعود کے ساتھ تھا۔ جدا ہوتے وقت، سلام کیا تھا اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے جواب دیا تھا۔ کتاب الآثار ص ۱۲۸۔ (مطبع اسلامی لاہور ۱۹۱۱ء) علامہ ابوبکر جصاصؒ نے حضرت علقمہ کی روایت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں "ظاہرہ یدل علی ان عبد اللہ بداھم بالسلام لان الرد لایکرہ عند احد"۔ احکام القرآن: ۳/۵۲۵ یعنی بظاہر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ان لوگوں کو سلام کیا تھا، اس لیے کہ جہاں تک سلام کے جواب کا تعلق ہے وہ کسی کے بھی نزدیک ناپسندیدہ نہیں ہے۔ [۳] نووی: شرح مسلم ج ۵ جز ۱۴/ ۱۴۵

سلیمان الاعمش کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابراہیم نخعی سے کہا کہ ایک نصرانی طبیب کے ہاں میری آمد و رفت رہتی ہے کیا میں اسے سلام کر سکتا ہوں۔ آپ نے جواب دیا کہ جب تمہاری اس سے کوئی حاجت ہے تو سلام کرو۔[۱]

حضرت ابراہیم نخعی کا قول علامہ قرطبی نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

اذا كانت لك حاجة عند يهودي او نصراني فابداه بالسلام۔	جب تمہیں کسی یہودی یا نصرانی سے کوئی حاجت درپیش ہو تو اس سے ملاقات کا آغاز سلام سے کرو۔

اس کے بعد لکھتے ہیں:

فبان بهذا ان حديث ابي هريرةؓ..... اذا كان لغير سبب يدعوكم الى ان تبدؤهم بالسلام من قضاء ذمام او حاجة تعرض لكم قبلهم او حق صحبة او جوار او سفر[۲]	اس سے واضح ہوا کہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت (جس میں غیر مسلم کو سلام کرنے سے منع کیا گیا ہے) کا تعلق بغیر کسی سبب کے سلام کرنے سے ہے، جیسے کسی حق کی ادائیگی یا کوئی حاجت جو تمہیں ان سے پیش آئے یا صحبت، ہمسائیگی اور سفر کا حق (اس طرح کا کوئی سبب ہو تو سلام کیا جا سکتا ہے)

فقہ حنفی میں کہا گیا ہے کہ ضرورت پر ذمی کو سلام کیا جا سکتا ہے۔ ہاں بغیر کسی ضرورت کے سلام کرنا ناپسندیدہ ہے۔ اسی طرح کہا گیا ہے کہ ضرورت کے تحت مصافحہ بھی جائز ہے لیکن بے ضرورت ناپسندیدہ ہے۔ بطور مثال ایک ضرورت یہ بیان ہوئی ہے کہ اگر کوئی مسلمان یہ محسوس کرے کہ سفر سے واپسی کے بعد وہ اپنے نصرانی پڑوسی سے مصافحہ نہ کرے تو اسے تکلیف پہونچے گی تو اسے مصافحہ کرنا چاہیے۔[۳]

اس طرح کے سماجی، معاشرتی، معاشی، طبی، علمی اور عملی ضروریات کی کوئی متعین

---

[۱] جصاص، احکام القرآن: ۳ / ۵۲۶۔

[۲] قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۱۱ / ۱۱۲۔

[۳] ابن عابدین، رد المحتار علی الدر المختار: ۵ / ۲۶۲۔
۲۸۴

فہرست نہیں ہے، آدمی اپنے حالات اور ماحول کے لحاظ سے ان کا تعین کرے گا جہاں کسی ضرورت کا تقاضا ہو غیر مسلم سے ملاقات، سلام اور مصافحہ بلا کراہت جائز سمجھنا چاہیے۔

تالیفِ قلب کے لیے سلام کی گنجائش

ایک خیال یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں شاید تالیفِ قلب کے لیے غیر مسلموں کو سلام کرنے کی اجازت تھی لیکن جب اسلام کو اقتدار اور استحکام حاصل ہو گیا تو اس کی ضرورت نہیں رہی[1]

یہ بات اس وقت صحیح ہوگی جب کہ ہمیں یقین کے ساتھ معلوم ہو کہ افشاء سلام کا حکم پہلے اور ممانعت کا بعد میں دیا گیا۔ لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ تالیفِ قلب کا مقصد غیر مسلموں کے قلوب کو اپنی زبان اور اپنے حسن سلوک سے اسلام کی طرف مائل کرنا بتایا گیا ہے[2] یہ کوئی وقتی اور ہنگامی مقصد نہیں ہے بلکہ مضبوط سے مضبوط اسلامی حکومت قائم ہو جائے تو بھی باقی رہے گا۔ اِلّا یہ کہ ریاست میں کوئی غیر مسلم ہی نہ ہو۔ صحیح بات یہ کہ اسلام نے جن اعلیٰ اخلاقیات کی تعلیم دی ہے سلام اسی کا ایک حصہ ہے۔ اس پر اسی پہلو سے غور کرنا چاہیے۔

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے مشترک مجمع کو سلام

اگر مجلس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں موجود ہوں تو سلام کیا جا سکتا ہے۔ اس کا ثبوت صریح حدیث سے ملتا ہے۔

حضرت اسامہ بن زید، بدر سے پہلے کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ آپ حضرت سعد بن عبادہؓ کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ سواری گدھے کی تھی۔ اس پر زین اور فدک کی چادر پڑی ہوئی تھی۔ پیچھے آپ نے حضرت اسامہؓ کو بٹھالیا۔ راستہ میں ایک ایسی مجلس سے گزر ہوا جس میں مسلمان، بت پرست مشرکین اور یہود تھے۔ ان میں مشہور منافق عبداللہ

---

[1] ابن حجر، فتح الباری: ۱/۵۶۔ عینی، عمدۃ القاری: ۱/۱۵۷۔

[2] ابن عابدین، رد المحتار علی الدر المختار: ۵/۳۶۴

بن ابی بھی تھا۔ اور حضرت عبداللہ بن رواحہ بھی مجلس میں موجود تھے۔ جب آپ قریب پہونچے تو سواری کی گرد وغبار اڑنے لگی۔ عبداللہ بن ابی نے چادر سے اپنی ناک ڈھک لی اور کہا کہ ہم لوگوں پر گرد وغبار نہ اڑاؤ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کیا اور سواری سے اتر گئے۔ ان لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دی اور قرآن کی تلاوت کی۔ عبداللہ بن ابی نے اس کے جواب میں کہا۔ اگر آپ کی بات حق ہے تو اس سے اچھی کون سی بات ہوسکتی ہے لیکن آپ ہمیں ہماری مجالس میں آکر پریشان نہ کریں۔ آپ اپنے مقام پر جائیں ہم میں سے جو آپ کے پاس پہونچیں انھیں اپنی باتیں سنائیں۔ حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے فرمایا کہ ہم چاہتے ہیں کہ آپ اپنی باتیں ہماری مجالس میں پیش فرمائیں، ہم انھیں پسند کرتے ہیں۔ اس کے بعد مسلمان اور مشرکین اور یہود ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے لگے اور مار پیٹ شروع ہوگئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں خاموش اور پرسکون رہنے کی تلقین فرمائی۔ پھر آپ اپنی سواری پر سوار ہوئے اور حضرت سعد بن عبادہؓ کے پاس پہونچے۔ فرمایا۔ اے سعد! کیا تم نے ابوحباب (عبداللہ بن ابی) کی باتیں سنیں۔ اس نے یہ اور یہ کہا ہے۔ انھوں نے فرمایا۔ اے اللہ کے رسولؐ اسے معاف فرمائیے۔ قسم خدا کی! اللہ نے آپ کو بڑا اونچا مقام عطا کیا ہے۔ مدینہ کے لوگوں نے یہ طے کر رکھا تھا کہ اسے تاج پہنائیں گے (بادشاہ بنائیں گے) اللہ تعالیٰ نے اس حق کے ذریعہ جو اس نے آپ کو عطا کیا ہے، اس منصوبہ کو ختم کردیا۔ اس وجہ سے اس کا دم گھٹنے لگا ہے اور یہ حرکت اس نے اسی وجہ سے کی ہے۔ چنانچہ آپ نے اسے درگذر کردیا[1]

اس حدیث سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں۔ اس سے آپ کی دعوتی جدوجہد، مخالفین تک اسے پہونچانے کی فکر، آپ کا صبر، حلم اور عفو ودرگذر اور چھوٹوں کی خبرگیری اور عیادت وغیرہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی سے اس بات کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کی ملی جلی مجلس کو سلام کیا جاسکتا ہے۔

حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ جب تمہارا گزر کسی ایسی مجلس پر ہو جس میں مسلم اور

---

[1] بخاری، کتاب الاستیذان، باب التسلیم فی مجلس فیہ اخلاط من المسلمین والمشرکین، کتاب المرضیٰ، باب عیادۃ المریض راکبا وماشیا۔ مسلم، کتاب الجہاد، باب مالقی النبیؐ من اذی المشرکین والمنافقین۔

غیر مسلم دونوں ہوں تو سلام کرو۔[1]

اس حدیث کی بنیاد پر امام نووی فرماتے ہیں کہ جس مجلس میں مسلمان اور کافر ہوں یا ایک ہی مسلمان ہو تو اسے سلام کیا جا سکتا ہے لیکن سلام کرتے وقت مسلمان کو مخاطب سمجھا جائے۔[2]

حضرت اسامہؓ کی اس حدیث میں جس مجلس کا ذکر ہے اس میں مسلمانوں میں عبداللہ بن رواحہؓ کی موجودگی کا تو ثبوت ملتا ہے لیکن یہ صراحت نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ان کو مخاطب سمجھ کر سلام کیا تھا۔ یہ بات ان احادیث کی بنیاد پر کہی گئی ہے جن میں غیر مسلموں کو سلام کرنے سے منع کیا گیا ہے لیکن جیسا کہ ہم نے عرض کیا ان کا موقع و محل دوسرا ہے۔

اس سلسلہ کا ایک سوال یہ ہے کہ صرف غیر مسلموں کے مجمع میں دعوت و تبلیغ کے لیے جانا ہو تو کیا اسے سلام کیا جا سکتا ہے؟ میرے خیال میں اس کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ اس لیے کہ جب انفرادی نوعیت کی سماجی، معاشرتی اور طبی ضروریات کے تحت غیر مسلم کو سلام کرنے کی فقہاء کے ہاں اجازت ملتی ہے تو دین کے عمومی مفاد اور دعوت و تبلیغ کے لیے بھی اس کی اجازت ہونی چاہیے۔ اس سے تالیفِ قلب کا بھی فائدہ حاصل ہو سکتا ہے، جس کی طرف بعض فقہاء نے اشارہ کیا ہے۔

سلام کے جواب کا حکم

اب سلام کے جواب کے مسئلہ کو لیجیے۔ اس کا حکم قرآن مجید میں ان الفاظ میں دیا گیا ہے:

وَإِذَا حُيِّيتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا	جب تمہیں کوئی سلام کرے تو اسے
بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا	اس سے بہتر طریقہ سے یا کم از کم اسی طرح
إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ	جواب دو۔ بیشک اللہ ہر چیز کا حساب لینے

۱؎ عبدالرزاق، المصنف: ۶/۱۶۔ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۱۱/۱۱۲

۲؎ نووی: شرح مسلم ج ۵ جز ۱۴ ص ۱۴۵۔

حَسِیْبًا ۝ (النساء: ۸۶) والا ہے۔

اس آیت کی بنیاد پر علامہ قرطبی کہتے ہیں۔

اجمع العلماء ان الابتداء بالسلام سنۃ مرغب فیہا وردہ فریضۃ[1]

علماء کا اتفاق ہے کہ سلام کے ذریعہ (ملاقات کی) ابتدا کرنا ایسی سنت ہے جس کی ترغیب دی گئی ہے رہا اس کا جواب دینا تو یہ فرض ہے۔

اس آیت کے ذیل میں علامہ ابن کثیر کہتے ہیں۔

ای اذا سلم علیکم المسلم فردوا علیہ افضل مما سلم اوردوا علیہ بمثل ما سلم فالزیادۃ مندوبۃ والمماثلۃ مفروضۃ[2]

یعنی جب تمہیں کوئی مسلمان سلام کرے تو اس نے جن الفاظ میں سلام کیا ہے ان سے بہتر یا ان ہی کے مثل الفاظ میں جواب دو۔ سلام سے زیادہ الفاظ میں جواب دینا مندوب اور پسندیدہ ہے اور ان ہی کے مثل الفاظ میں جواب دینا فرض ہے۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی مسلمان نے 'السلام علیکم' کہا تو اس کے جواب میں 'وعلیکم السّلام' کہنا بھی صحیح ہے اور 'وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ' بھی کہا جاسکتا ہے پہلی صورت اسی کے مثل جواب کی اور دوسری صورت بہتر جواب کی ہے۔ کسی مسلمان نے 'السلام علیکم ورحمۃ اللہ' کہا تو اس کے جواب میں 'وعلیکم السّلام ورحمۃ اللہ' کہنا اسی جیسا جواب ہوگا اور بہتر جواب یہ ہے کہ 'وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ' کہا جائے۔ اگر کسی نے 'السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ' کہا تو اس کے جواب میں 'وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ' کہا جائے گا۔ اس میں مزید الفاظ کا اضافہ نہیں ہوگا۔[illegible]

[1] قرطبی: الجامع لاحکام القرآن ۵/ ۲۹۸ [2] ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم ۱/ ۵۳۰

[3] یہ تفصیل ابن جریر، ابن مردویہ، طبرانی اور ابن منذر کی ایک روایت میں ملتی ہے لیکن اس میں ضعف ہے۔ علامہ سیوطی نے اسے حسن کہا ہے۔ تفسیر طبری: ۸/ ۵۹۰-۵۸۹ تحقیق محمود محمد شاکر ابن کثیر تفسیر ۱/ ۵۳۱

ان تفصیلات کا تعلق اسلام کے ماننے والوں سے ہے۔ سوال یہ ہے کہ غیر مسلم کے سلام کا بھی جواب دیا جائے گا یا نہیں؟ سورۂ نساء کی مذکورہ بالا آیت سے استدلال کرتے ہوئے حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں۔

ردوا السلام علی من کان یہودیا او نصرانیا او مجوسیا[1]
سلام کا جواب دو چاہے وہ یہودی یا نصرانی یا مجوسی ہو۔

علامہ ماوردی فرماتے ہیں کہ سلام کرنا نفل اور مستحب ہے لیکن اس کا جواب دینا فرض ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ، قتادہ اور ابن زید کے نزدیک مسلم اور کافر دونوں کے سلام کا جواب دینا فرض ہے، لیکن حضرت عطاء کی رائے یہ ہے کہ مسلمان کے سلام کا جواب دینا تو فرض ہے کافر کے سلام کا جواب دینا فرض نہیں ہے[2]۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں ذمیوں کے سلام کا جواب دینے یا نہ دینے کے مسئلہ میں اختلاف ہے۔ جس طرح مسلمان کے سلام کا جواب دینا واجب ہے کیا اسی طرح ذمیوں کے سلام کا جواب دینا بھی واجب ہے؟ حضرت عبداللہ بن عباس، شعبی اور قتادہ سورۂ نساء کی آیت سے تمسک کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ذمیوں کے سلام کا جواب دینا بھی واجب ہے، لیکن امام مالک، جیسا کہ اشہب اور ابن وہب نے ان سے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں کہ یہ واجب نہیں ہے۔ اگر جواب دیا بھی جائے تو صرف 'علیک' کہا جائے[3]۔

= حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول ہے کہ 'السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ' پر سلام ختم ہو جاتا ہے۔ اس پر اضافہ صحیح نہیں ہے۔ چنانچہ ایک شخص نے اضافہ کیا تو اسے انھوں نے منع فرمایا۔ موطا، کتاب السلام، باب العمل فی السلام۔

[1] بخاری، الادب المفرد مع فضل اللہ الصمد: ۲/۵۴۳۔ اس کے ایک راوی عبداللہ بن ثور پر بعض محدثین نے جرح کی ہے لیکن یہ روایت کئی دوسرے طرق کے ساتھ طبری میں ہے۔ اس کے راویوں میں مجروح راوی نہیں ہے۔ طبری کے الفاظ ہیں: من سلم علیک من خلق اللہ فاردد علیہ وان کان مجوسیا۔ تفسیر طبری طبع جدید: ۸/۵۸۸۔ چنانچہ حافظ ابن حجر نے اس کی سند پر کوئی [illegible] نہیں کی ہے بلکہ اس کی توثیق کی ہے۔ فتح الباری: ۱۱/۴۲

[2] ماوردی، النکت والعیون: ۱/۴۱۱۔

[3] قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۵/۳۰۴۔ نیز ملاحظہ ہو ۱۷/۲۹۳۔
۳۷۹

امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں مشرک کو سلام نہیں کیا جائے گا البتہ اس کے سلام کا جواب دیا جائے گا۔ امام محمد کے بقول یہی ہمارے عام فقہاء کا قول ہے[1]

امام نووی فرماتے ہیں شوافع کا مسلک یہ ہے کہ غیر مسلموں کو سلام کرنے میں پیش قدمی کرنا حرام ہے لیکن جواب دینا واجب ہے۔ البتہ جواب میں وعلیکم یا علیکم کہا جائے گا۔ اس سے زیادہ نہیں یہی اکثر علماء اور عام سلف کی رائے ہے[2]

غیر مسلم کے سلام کا جواب کس طرح دیا جائے؟

سلف میں سے بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ سورۂ نساء میں سلام کا جواب بہتر طریقہ سے دینے یا سلام کے الفاظ دہرا دینے کا حکم ہے۔ ان میں سے پہلی صورت مسلمانوں سے اور دوسری صورت غیر مسلموں سے متعلق ہے۔

ابن زید کہتے ہیں۔

حق علی کل مسلم حیی بتحیة	جس کسی مسلمان کو بھی سلام کیا جائے
ان یحیی باحسن واذا حیاہ	اس پر واجب ہے کہ بہتر طریقہ سے جواب
غیر اھل اسلام ان یرد علیه	دے اور جب اسے اہل اسلام کے علاوہ
مثل ما قال[3]	کوئی دوسرا اسلام کرے تو اسی جیسا جواب دے۔

حضرت قتادہ کہتے ہیں بہتر طریقہ سے جواب مسلمان کے لیے ہے اور سلام کرنے والے کے الفاظ ہی کو لوٹا دینا اہل کتاب کے لیے ہے[4]

آیت میں بظاہر مسلم اور غیر مسلم کی تفریق نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے اس کے پیچھے یہ خیال ہو کہ ایک مسلمان کا اخلاقی حق غیر مسلم کے حق سے زیادہ ہے اس لیے ایک کافر کے سلام کا جن الفاظ میں جواب دیا جاتا ہے ان سے بہتر الفاظ میں مسلمان کے سلام کا جواب

---

[1] جصاص، احکام القرآن: ۵۲۵/۳

[2] نووی: شرح مسلم ج ۵ جز ۱۴ ص ۱۴۵

[3] طبری، جامع البیان: ۵۸۸/۸

[4] طبری، جامع البیان: ۵۸۷/۸

دیا جانا چاہیے۔

یہ تفصیلات بتاتی ہیں کہ اس امر میں علماء میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ غیر مسلم کے سلام کا جواب دیا جاسکتا ہے۔ بعض حضرات نے اسے ضروری بھی قرار دیا ہے البتہ یہ بحث ضرور ہے کہ جواب کن حدود میں ہو اور اس کے لیے کیا الفاظ استعمال کیے جائیں۔

سلام کرنے میں یہود کی شرارت اور اس کا جواب

ہمارے خیال میں اس کا تعلق اس بات سے ہے کہ ایک غیر مسلم کا مجموعی رویہ کیا ہے اور کن الفاظ میں وہ سلام کرتا ہے۔ یہودِ مدینہ کی عداوت اور دشمنی بالکل نمایاں تھی جب بھی موقع ملتا ان کے بغض و عناد کا مظاہرہ ہوتا تھا۔ سلام بھی کرتے تو نازیبا اور غیر شائستہ الفاظ استعمال کرتے تھے۔ قرآن مجید کا بیان ہے۔

وَإِذَا جَآءُوكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ وَيَقُولُونَ فِىٓ أَنفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُولُ حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ يَصْلَوْنَهَا فَبِئْسَ الْمَصِيرُ (المجادلہ : ۸)	جب وہ آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ کو سلام اس طرح کرتے ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ پر سلام نہیں بھیجا ہے اور اپنے جی میں کہتے ہیں کہ ہماری اس حرکت پر اللہ ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا جہنم ان کے لیے کافی ہے اس میں وہ داخل ہوں گے اور وہ برا ٹھکانا ہے۔

یہود کے اس رویہ کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں سلام کرنے سے منع فرمایا اور ہدایت فرمائی کہ ان کے شرارت آمیز سلام کے جواب میں صرف یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ وہی کچھ کرے جو تم ہمارے ساتھ چاہتے ہو۔ احادیث میں اس کی تفصیل ملتی ہے۔ یہاں بعض احادیث پیش کی جارہی ہیں۔

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کرامؓ نے دریافت کیا۔

ان اهل الكتاب يسلمون علينا فكيف نرد عليهم قال	اہلِ کتاب ہمیں سلام کرتے ہیں ہم انھیں جواب کس طرح دیں۔ آپ نے

قولوا وعلیکم[1] فرمایا 'وعلیکم' کہہ دو۔

حضرت انسؓ ہی کی ایک اور روایت ہے۔

اذا سلم علیکم اھل الکتاب جب اہل کتاب تمہیں سلام کریں تو تم

فقولوا وعلیکم[2] 'وعلیکم' کہو۔

بعض دوسری روایات سے اس جواب کی وجہ بھی معلوم ہوتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اذا سلم علیکم الیھود فانما یہود تمہیں جب سلام کرتے ہیں تو 'السام

یقول السام علیکم فقل وعلیک[3] علیکم' کہتے ہیں۔ تم جواب میں 'وعلیک' کہہ دو۔

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ قریب سے گزرتے ہوئے ایک یہودی نے 'السام علیکم' کہا۔ خدمت میں جو صحابہؓ موجود تھے انھوں نے اس کے سلام کا جواب دیا۔ آپ نے صحابہؓ سے فرمایا تمہیں معلوم ہے کہ اس نے کیا کہا؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ اس نے سلام کیا تھا۔ آپ نے فرمایا نہیں! اس نے 'السام علیکم' کہا (تمہیں موت آئے یا تم اپنے دین سے اکتا جاؤ) اسے واپس بلاؤ تاکہ دریافت کیا جائے۔ اسے واپس بلایا گیا۔ دریافت کرنے پر اس نے اعتراف کیا کہ اس نے 'السام علیکم' ہی کہا تھا۔ آپ نے فرمایا جب اہل کتاب تمہیں سلام کریں تو تم 'علیکم ما قلتم' کہو۔ (یعنی تم پر وہ چیز طاری ہو جس کی تم نے ہمارے لیے دعا کی ہے۔)[4]

ان روایات سے واضح ہے کہ یہود سلام کرنے میں بھی شرارتِ نفس اور خبثِ باطن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ اس کا شریفانہ اور باوقار انداز میں جواب دینے کی ہدایت کی گئی کہ تمہارے یہ الفاظ تمہارے ہی لیے مبارک ہوں۔ تم ہماری تباہی اور بربادی کے آرزو مند ہو۔ خدا تمہیں اسی سے دوچار کرے۔ اس سے آگے بڑھ کر جواب میں بدزبانی

---

[1] مسلم، کتاب السلام، باب النہی عن ابتداء اہل الکتاب بالسلام وکیف یرد علیہم۔ ابوداؤد، ابواب السلام، باب فی السلام علی اہل الذمہ۔

[2] بخاری، کتاب الاستیذان، باب کیف الرد علی اہل الذمہ۔ مسلم، کتاب السلام، باب النہی عن ابتداء اہل الکتاب الخ۔

[3] بخاری ومسلم حوالۂ سابق۔

[4] رواہ البزار وابن حبان۔ فتح الباری: ۱۱/۴۳ ورواہ البخاری فی الادب المفرد مختصراً۔ ۲/۵۳۲-۵۳۳

اور بدکلامی سے منع کیا گیا ہے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہود کے کچھ افراد آئے اور 'السام علیک' کہا۔ میں سمجھ گئی کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں نے جواب دیا 'علیکم السام واللعنة' (موت تمھیں آئے اور خدا کی لعنت تم پر ہو) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عائشہ! صبر سے کام لو، درشت کلامی سے احتراز کرو، اللہ تعالیٰ ہر معاملہ میں رفق و ملاطفت اور نرمی کو پسند کرتا ہے۔ میں نے عرض کیا۔ انھوں نے جو کہا کیا وہ آپ نے نہیں سنا؟ آپ نے فرمایا میں نے سنا ہے اور اس کے جواب میں 'وعلیکم' کہہ دیا ہے۔ (یعنی موت اور اکتاہٹ تم پر آئے۔ یہ جواب کافی ہے)[1]

جواب میں نازیبا الفاظ کے استعمال کی ممانعت

اس سے واضح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہود کی سازشوں اور ان کے طنز و تعریض سے اچھی طرح واقف تھے، آپ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ سلام کرتے وقت غیر مہذب الفاظ استعمال کرتے ہیں لیکن زبان مبارک جواب میں نامناسب کلمات سے پاک رہی۔ اسی کی تعلیم آپ نے صحابہ کرامؓ کو دی اور فرمایا ہم ان کے حق میں جو دعا کریں گے وہ تو قبول ہوگی لیکن وہ جو بددعا کر رہے ہیں وہ قبول نہیں ہوگی[2] اس لیے کہ ہم مظلوم اور وہ ظالم ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت مظلوم کو حاصل ہوتی ہے اور ظالم اس سے محروم رہتا ہے۔

بعض لوگوں نے کہا ہے یہود جس طرح 'السلام علیکم' کو زبان کی لوچ سے 'السام علیکم' کر دیتے ہیں اسی طرح ان کے جواب میں زبان کو گھما کر 'علیکم السلام' کہنا چاہئے۔ اس کے معنی ہیں تم پر پتھر پڑیں یا 'علاکم السلام' کہا جائے یعنی تم سے سلامتی اٹھ جائے لیکن جیسا کہ علامہ ابن عبد البر نے کہا ہے یہ طریقہ صحیح نہیں ہے۔ ذمیوں کو برا بھلا کہنا اور ان کے ساتھ بدزبانی کرنا جائز نہیں ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس کی تائید اس بات سے ہوتی

---

[1] بخاری، کتاب الاستیذان، باب کیف الرد علی اہل الذمۃ۔ مسلم، کتاب السلام، باب النہی عن ابتداء اہل الکتاب بالسلام الخ۔

[2] بخاری، کتاب الدعوات، باب قول النبیؐ یستجاب لنا فی الیہود الخ۔ مسلم، کتاب السلام، باب النہی عن ابتداء اہل الکتاب بالسلام الخ۔

ہے کہ حضرت عائشہؓ نے جب انھیں برا بھلا کہنا چاہا تو آپ نے اسے ناپسند فرمایا[1]

اوپر کی روایات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود کے بغض و عناد، ان کی شرارت اور ان کی بدزبانی اور بدکلامی کی وجہ سے انھیں سلام نہ کرنے یا ان کے سلام کا خاص طریقہ سے جواب دینے کا حکم دیا گیا ہے، لیکن جہاں غیر مسلموں سے بہتر روابط ہوں اور وہ مسلمانوں کے ساتھ عداوت اور مخاصمت کا رویہ نہ رکھتے ہوں وہاں اگر کوئی غیر مسلم، اسلامی تعلیمات یا اسلامی معاشرہ کے زیر اثر کسی مسلمان کو 'السلام علیکم' کے ذریعہ خطاب کرے تو جواب میں اس کا رویہ بھی بظاہر مختلف ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ حالات کے بدلنے سے احکام بھی بدل جاتے ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے بعض علماء نے ممانعت کے حکم کو ایسا حکم نہیں مانا ہے جو ابدی ہو اور جس پر عمل ہر حال میں لازم ہو۔ ان کے نزدیک غیر مسلم کے سلام کے جواب میں اسی طرح وعلیکم السلام کہا جا سکتا ہے جیسے مسلمان کے سلام کے جواب میں کہا جاتا ہے[2]

شوافع میں سے بعض کی یہ رائے ہے کہ وعلیکم السلام تو کہا جا سکتا ہے لیکن اس سے آگے 'ورحمۃ اللہ' کا اضافہ غلط ہوگا[3]

لیکن امام شعبی اسے غلط نہیں سمجھتے ایک نصرانی نے انھیں سلام کیا تو انھوں نے جواب میں 'وعلیک السلام ورحمۃ اللہ' کہا اس پر اعتراض کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ کیا وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت میں جی نہیں رہا ہے؟[4]

سلام کے معاملہ میں ذمی اور حربی کا فرق

بعض حضرات نے اس معاملہ میں ذمی اور حربی کا فرق کیا ہے[5] یہ اس بات کی

---

[1] فتح الباری: ۱۱/ ۴۵

[2] حافظ ابن حجر فرماتے ہیں۔ وذهب جماعة من السلف الى انه يجوز ان يقال فى الرد عليهم وعليكم السلام كما يرد على المسلم۔ فتح الباری: ۱۱/ ۴۵۔ نیز ملاحظہ ہو عینی، عمدۃ القاری: ۱۸/ ۳۰۶

[3] نووی: شرح مسلم جلد ۵ جزء ۱۴ ص ۱۴۵

[4] زمخشری، الکشاف عن حقائق التنزیل: ۱/ ۵۵۰

[5] حافظ ابن حجر فرماتے ہیں۔ وعن بعضهم التفرقة بين اهل الذمة واهل الحرب۔ فتح الباری۔ ۱۱/ ۴۵۔ نیز ملاحظہ ہو عینی، عمدۃ القاری: ۱۸/ ۳۰۶۔

دلیل ہے کہ جو غیر مسلم اسلامی مملکت کے شہری ہیں، جن کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت اس کے ذمہ ہے اور جو اس کے امن و امان میں ہیں ان کے ساتھ سلام و کلام کا وہ انداز نہیں ہوگا جو ان لوگوں کے ساتھ اختیار کیا جا سکتا ہے جو اسلامی مملکت سے برسرِ پیکار ہیں۔

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے ایک ذمی کو خط میں سلام لکھا۔ بعض لوگوں نے کہا کہ کیا آپ غیر مسلم کو سلام لکھ رہے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا اس نے اپنے خط میں مجھے سلام لکھا تھا میں نے اس کا جواب دیا ہے[1]

مشہور محدث ابن عیینہ سے سوال کیا گیا۔

هل یجوز السلام علی الکافر؟ کیا کافر کو سلام کرنا جائز ہے؟

انھوں نے جواب دیا 'نعم' ہاں دیا جا سکتا ہے اور پھر سورۂ ممتحنہ کی یہ آیت پڑھی لاینھاکم اللہ الآیۃ جس میں کہا گیا ہے کہ "اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور حسن سلوک سے منع نہیں کرتا جنھوں نے تم سے جنگ نہیں کی اور تمھیں اپنے وطن سے نہیں نکالا۔ وہ تو ان لوگوں سے قریبی تعلق رکھنے سے منع کرتا ہے جنھوں نے تم سے جنگ کی، تمھیں تمھارے گھروں سے نکالا اور اس معاملہ میں دوسروں کی مدد کی"۔ (ممتحنہ: ۸-۹)

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حربی اور غیر حربی یا معاہد اور غیر معاہد کے درمیان فرق کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک قرآن چونکہ غیر حربی کے ساتھ حسن سلوک سے منع نہیں کرتا اس لیے اسے سلام بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی حسن سلوک میں داخل ہے۔

غیر مسلم کو سلام کے لیے مناسب الفاظ

ایک خیال یہ بھی ہے کہ سلام اور اس کے جواب کے الفاظ مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہیں غیر مسلموں کے لیے دوسرے الفاظ استعمال کیے جانے چاہئیں۔ اس کی تائید میں وہ خط پیش کیا جاتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شاہ روم ہرقل کو لکھا تھا۔ وہ اس طرح شروع ہوتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم من محمد عبد اللہ و رسولہ الی	اللہ کے نام سے جو رحمٰن و رحیم ہے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جانب سے جو اللہ

[1] بخاری، الادب المفرد: ۲/۵۲۹ [2] قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: ۱۱/۱۱۱

هرقل عظیم الروم، السلام علی من اتبع الہدیٰ۔ اما بعد.... [1]	کے بندے اور اس کے رسول ہیں، ہرقل کی طرف جو روم کا سربراہ ہے۔ سلام ہے اس شخص پر جو ہدایت کی اتباع کرے۔ اما بعد۔

محدث ابن بطال کہتے ہیں کہ یہ ان لوگوں کی دلیل ہے جن کے نزدیک اہل کتاب سے مراسلت میں وقت ضرورت انھیں سلام لکھنا جائز ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ والسلام علی من اتبع الہدیٰ کا سیاق وسباق دوسرا ہے۔ اس میں ایک اصولی بات کہی گئی ہے کہ جو حق اور ہدایت پر عمل کرے اس کے لیے سلامتی ہے۔ اس میں وہ شخص شامل نہ ہوگا جو حق کی اتباع نہ کرے۔ غیر مسلموں کو جو خطوط لکھے جائیں ان میں اس طرح کا عمومی انداز اختیار کیا جاسکتا ہے[2]

قتادہ کہتے ہیں اہل کتاب کے گھر جاؤ تو کہو 'السلام علی من اتبع الہدیٰ' (سلامتی ہے ہر اس شخص پر جو ہدایت کی اتباع کرے)[3] یہی بات امام ابو یوسف نے کہی ہے[4] 'السلام علینا وعلی عباد اللہ الصالحین' (سلامتی ہو ہم پر اور اللہ کے تمام نیک بندوں پر) جیسے الفاظ بھی استعمال کیے جاسکتے ہیں[5]

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک شخص کو سلام کیا۔ اس نے جواب دیا۔ بعد میں آپ کو بتایا گیا کہ یہ شخص نصرانی ہے۔ آپ اس کے پاس گئے اور فرمایا کہ میرا سلام واپس کردو[6] امام مالک فرماتے ہیں کہ اس کی ضرورت نہیں ہے[7] بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اس کا

---

[1] بخاری، کتاب الاستیذان، باب کیف یکتب الی اہل الکتاب۔ گرامی نامہ کے پورے مضمون اور اس سلسلہ کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ بخاری، کتاب بدء الوحی، نیز۔ کتاب الجہاد، باب دعاء النبیؐ الناس الی الاسلام والنبوۃ۔

[2] فتح الباری: ۱۱/۴۷۔ نیز ۱/۳۸

[3] عبدالرزاق۔ المصنف: ۶/۱۲

[4] زمخشری، الکشاف عن حقائق التنزیل: ۱/۵۵۰

[5] فتح الباری: ۱۱/۴۰

[6] بخاری، الادب المفرد: ۲/۵۳۹

[7] موطا، کتاب السلام، باب ما جاء فی السلام علی الیہود والنصاریٰ۔

بھی ایک فائدہ ہے۔ وہ یہ کہ غیر مسلم کے علم میں یہ بات آجائے گی کہ سلام کے مخصوص الفاظ غیر مسلموں کے لیے استعمال نہیں کیے جاتے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ خصوصًا جس شخص کے عمل کو لوگ نمونہ اور دلیل کے طور پر پیش کرتے ہوں اسے ایسا کرنا چاہیے تاکہ دوسرے اس سے احتراز کریں[1] حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے عمل کی اس سے توجیہ کی جاسکتی ہے۔

حضرت عقبہ بن عامرؓ کو ایک شخص نے جو صورت شکل سے مسلمان لگ رہا تھا، سلام کیا۔ انھوں نے جواب میں 'وعلیك ورحمة اللّٰه وبركاته' کہا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ شخص نصرانی ہے۔ حضرت عقبہ بن عامرؓ اس کے پاس گئے اور کہا کہ اللہ کی رحمت مسلمان کے لیے ہے (لہٰذا یہ الفاظ اسی کے لیے استعمال ہوسکتے ہیں) پھر اسے دعا دی 'اطال اللّٰه حياتك واكثر مالك وولدك' (اللہ تعالیٰ تمہاری عمر دراز کرے اور تمہارے مال واولاد میں اضافہ فرمائے[2]

علامہ زمخشری کہتے ہیں۔

ولا بأس بالدعاء له بما يصلحه في دنياه[3]	اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ اسے دنیا کی صلاح اور بہتری کی دعا دی جائے۔

خلاصۂ بحث

ان تفصیلات سے واضح ہے کہ سلام اسلامی تہذیب کا شعار ہے۔ زیادہ تر علماء سلف اس کے قائل ہیں کہ غیر مسلم کو سلام نہیں کیا جائے گا اور اس کے سلام کا جواب بھی وعلیك یا وعلیکم کی حد تک دیا جائے گا۔ اس سے زیادہ نہیں۔ لیکن سلف ہی میں جن اصحاب نے اس سے اختلاف کیا ہے ان کے نزدیک سلام کو عام کرنے کا حکم ہے اس لیے غیر مسلم کو بھی سلام کیا جاسکتا ہے۔ اس میں مسلم اور غیر مسلم کا فرق صحیح نہیں ہے۔ بعض حضرات نے اس مسئلہ میں سماجی ومعاشرتی تعلقات کو بھی اہمیت دی ہے۔ بعض نے

---

[1] فتح الباری: ۱۱/ ۴۶۔

[2] بخاری، الادب المفرد: ۲/ ۵۳۸۔

[3] الکشاف عن حقائق التنزیل: ۱/ ۵۵۰۔

ذمی اور حربی کا فرق کیا ہے اس لیے کہ خود قرآن میں یہ فرق موجود ہے۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ غیر مسلموں کے لیے ’السلام علیکم ورحمۃ اللہ‘ کے مسنون الفاظ کی جگہ ان کی ہدایت اور فلاح و کامیابی کی دعا کی جائے۔ ان سب رایوں کی روشنی میں ہمیں ایک ایسے معاشرہ کے بارے میں سوچنا چاہیے جو مسلمانوں اور غیر مسلموں کا ملا جلا اور مخلوط معاشرہ ہے، جہاں دونوں کے درمیان ثقافتی، سماجی، معاشی غرض مختلف نوعیت کے تعلقات موجود ہیں اور دونوں قانونی اور دستوری روابط میں بندھے ہوئے ہیں۔ اس طرح کے معاشرہ میں غیر مسلموں کو مسنون طریقہ سے سلام کیا جائے تو یہ مخالفِ سلف عمل نہ ہوگا۔ ہو سکتا ہے اس طرح وہ آہستہ آہستہ اسلامی آداب سے مانوس ہوتے چلے جائیں اور ان کی معنویت ان پر زیادہ بہتر طریقہ سے واضح ہو جائے۔ اس میں قباحت محسوس ہو تو ان کے لیے عزت و احترام اور محبت و خیر خواہی کے دوسرے الفاظ استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ البتہ اس بات کا ضرور خیال رکھنا ہوگا کہ تعلقات کے اظہار میں ایسے طریقے نہ اختیار کیے جائیں جو کسی دوسرے مذہب یا تہذیب کے مخصوص شعار کی حیثیت رکھتے ہوں اور ایسے الفاظ نہ استعمال کیے جائیں جو اسلامی عقائد سے متصادم ہوں۔

ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی کی ایک اہم پیش کش
مولانا سید جلال الدین عمری کی کتاب
اسلام اور مشکلاتِ حیات
- اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے نافرمانوں پر مشکلات اور مصائب کیوں آتے ہیں؟
- اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کو ملی اور اجتماعی، شخصی اور انفرادی مشکلات سے کیوں گزارا جاتا ہے؟
- امراض، جسمانی تکالیف، مالی مشکلات، حادثات اور صدمات میں ایک مومن کا کیا رویہ ہونا چاہیے؟
- مرض اور مشکلات حیات میں خودکشی کیوں ناجائز ہے؟
- مرض کی شدت میں کسی کی جان کیوں نہیں لی جا سکتی؟

یہ کتاب قرآن و حدیث کی روشنی میں ان سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے، مؤثر انداز بیان، دل نشیں بحث اور علمی اسلوب، آفسٹ کی حسین طباعت، خوب صورت سرورق۔ ضخامت ۸۸ صفحات۔ قیمت ۸ روپیے
ملنے کا پتہ: مینجر مکتبہ تحقیق و تصنیف اسلامی۔ پان والی کوٹھی۔ دودھ پور علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

برطانوی راج کے خلاف مسلمانانِ ہند کی سیاسی اور علمی جدوجہد
(۱۸۵۸ - ۱۷۵۷ء)

ڈاکٹر اقبال حسین

سیاسی جدوجہد

ہندوستان کی تاریخ میں جنگِ پلاسی (۱۷۵۷ء) کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس جنگ کے دو نمایاں پہلو قابلِ توجہ ہیں۔ اول برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کی "جنگ اور اتحاد" کی سیاست کے ذریعہ علاقائی توسیع، دوم ہندوستانی عوام کے مختلف طبقوں میں نئی حکومت کے خلاف بڑھتی ہوئی بے چینی اور اضطراب۔ عوام میں روز افزوں بے چینی کا مظاہرہ مقامی اور علاقائی بغاوتوں کی شکل میں ہندوستان کے مختلف گوشوں میں ہوتا رہا اور بالآخر اس کا اختتام ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کی شکل میں نمودار ہوا جسے انگریزی مدبرانِ وقت نے بغاوت کا نام دے کر اس کی اصل اہمیت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ اس مختصر مضمون میں اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ کس طرح انیسویں صدی کے وسط میں ہندوستانی مسلمانوں کے ایک اہم عنصر یعنی علمائے کرام نے، برطانوی حکومت کے قیام کے بعد سے ہی، اس کے خلاف نظریاتی جدوجہد کے ذریعہ، سبب اور ربط، کو خوب صورتی سے یکجا کر کے عوام کو اور بالخصوص مسلمانوں کو ایک عظیم تحریک کے لیے تیار کر دیا تھا۔ اس دور کے علما کی اکثریت اہلِ قلم اور اہلِ سیف کی تھی، ان کا یہ بھی بڑا کمال تھا کہ اُن کا علم، اسلام تک محدود نہیں تھا۔ اُن کی مختلف مذاہب جیسے یہودیت، نصرانیت اور ہندو مذہب پر بھی بہت اچھی نظر تھی۔ اس علمِ ادیان، کی وجہ سے وہ اسلام کی عظمت اور برتری کے ساتھ دیگر مذاہب اور ادیان کی کمزوریوں سے بھی واقف تھے۔ تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ برطانوی حکومت کی صد سالہ حکومت (۱۸۵۷ - ۱۷۵۷) کی لوٹ کھسوٹ، طور طریقوں

کی وجہ سے عوام کے ساتھ علما بھی الجھنوں کا شکار رہتے، اور اس حکومت سے نجات حاصل کرنے کے لیے سرگرم عمل تھے۔

پلاسی کی جنگ کے بعد ہندوستانی سیاست، معیشت کا ڈھانچہ بتدریج اپنی روایتی شناخت کھونے لگا تھا۔ اس کا اولین اثر بنگال پر ہوا کیونکہ برطانوی ہوس جہانبانی کا شکار سب سے پہلے یہی صوبہ ہوا تھا۔ اس سلسلہ میں انگریزوں کے ایک وفادار اور مستند مورخ سید غلام حسین طباطبائی کا بیان قابل توجہ ہے۔ وہ انگریزوں کو آگاہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ خراب طرز حکومت کا انجام کیا ہوتا ہے۔ اپنے انتباہ کو تقویت دینے کے لیے وہ شاہزادہ عالی گوہر (بعدازاں شاہ عالم دوم) کی مثال پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شاہزادہ بنگال اور بہار کے عوام میں ہر دل عزیز تھا۔ عوام اُسے عزت و احترام سے دیکھتے تھے کیونکہ وہ مغل شہزادہ تھا جن کے اجداد نے ہندوستان میں بہت سے اچھے کام کیے تھے۔ لیکن اُنہی عوام نے اپنی نیک خواہشات، احترام اور ہمدردی کے جذبات ختم کر دیئے کیونکہ شاہزادہ عالی گوہر اپنی فوج کی زیادتیوں پر قابو نہیں رکھ سکے جس کی وجہ سے عوام اور رعیت مصائب کا شکار ہوئی۔ غلام حسین مزید رقمطراز ہیں کہ ابتدا میں عموماً عوام برطانوی حکمرانوں کے خلاف کسی قسم کا عناد نہیں رکھتے تھے لیکن جب وہ بھی کمپنی کے افسران اور اہل کاروں کو لوٹ اور تعدی سے روک نہ سکی تو اُن کا رویہ بدل گیا، کیونکہ کمپنی کے اعلا اور ادنیٰ ملازمین بد دیانت تھے۔ غلام حسین اپنی تنقید جاری رکھتے ہوئے مزید رقمطراز ہیں کہ نئی حکومت کے زیر سایہ صنعت و حرفت تباہ ہوگئی جس کی وجہ سے اہل حرفہ بے روزگار ہو گئے، ان میں سے بیشتر یا تو کاسۂ گدائی لے کر شکم پروری کرنے لگے یا پھر اُنھوں نے قزاقی اور رہزنی کا پیشہ اختیار کر لیا، ایک کثیر تعداد میں لوگ تلاش معاش میں ترک وطن کر گئے۔[1]

بنگال میں برطانوی حکومت کے قیام کے بعد حکومت کی تمام اہم اور ذمہ دار جگہوں پر تقرری میں امتیاز کی پالیسی، اور ملک کی دولت برطانیہ کو منتقل کرنے سے بے شمار لوگوں کو تباہ ہونا پڑا۔ غلام حسین غالباً پہلے ہندوستانی مورخ ہیں جنھوں نے ہندوستانی

---

[1] سیر المتاخرین، نول کشور، ص ص ۳۷-۳۶۸ ۳۹۰

دولت کے انگلینڈ منتقل کرنے پر تنقید کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "برطانوی تسلط سے پہلے معاملہ دگر تھا، پہلے یہ صاحبان (انگریز) سونا اور چاندی اس ملک میں لاتے تھے جو یہاں آنے کے بعد پہلے سے موجود ذخیرہ کو اور زیادتی کے ساتھ گردش میں لاکر ہر شخص کی خوش حالی میں اضافہ کرتا تھا"[۱ه] بعدازاں غلام حسین افسوس کے ساتھ لکھتے ہیں کہ نئی برطانوی حکومت کا عوام سے کوئی بلاواسطہ تعلق نہیں ہے اور انھوں نے اُن کو اُن کی تجارتی سرگرمیوں سے محروم کر دیا ہے۔ صاحب علم وفن کی پذیرائی اور معیشت کا پرانا طریقہ کار، عطیہ جاگیرات وغیرہ منسوخ ہو چکا ہے۔ ہندوستانیوں کو فوجی ملازمت نہیں دی جاتی ہے جو وہ زمانۂ دراز سے حاصل کرتے رہے تھے۔ انگریزوں نے تجارت کو اپنی اجارہ داری میں لے لیا ہے۔ مزید براں اُن کی اپنے ہم وطنوں کی نامناسب جانب داری کے طرز عمل نے ہندوستانیوں کے لیے سخت حالات پیدا کر دیئے ہیں۔ اس کے بعد غلام حسین طباطبائی ایک اہم اور معنی خیز جملہ لکھتے ہیں کہ ہندوستان کے عوام، مغل بادشاہ ہی کو اپنا بادشاہ تسلیم کرتے ہیں[۲ه] ظاہر ہے کہ بنگال میں مغل حکومت کے سیاسی زوال اور برطانوی حکومت کے اقتدار کے باوجود، عوام کا مغل بادشاہ کی حاکمیت کو تسلیم کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ مغل بادشاہ کی ہر دل عزیزی کس حد تک قائم تھی۔ کمپنی کی حکومت بھی اس نکتہ سے آگاہ تھی جس کا ثبوت ۱۷۶۵ء میں شاہ عالم بادشاہ اور برطانوی کمپنی کے معاہدہ سے ملتا ہے جس کے تحت شاہ عالم نے انگریزوں کو بنگال، بہار اور اڑلیسہ کی دیوانی کے حقوق بطور عطیہ دئے تھے اور انگریزوں نے شاہ عالم کی فرماں روائی تسلیم کرتے ہوئے، ان کو مبلغ ۲۶ لاکھ روپئے سالانہ بطور خراج دینے پر رضامندی ظاہر کی تھی[۳ه] عملاً، بلاشبہ صورت حال دوسری تھی، کیونکہ انگریز یہ رقم پنشن کی طرح ادا کر رہے تھے۔ جسے اُنھوں نے شاہ عالم کے الٰہ آباد چھوڑنے کے بعد عملاً بند ہی کر دیا۔ تاہم، عوام میں مغلوں کی ہر دل عزیزی اور مغل بادشاہ سے اُن کے لگاؤ کے پیش نظر مصلحت یہی

۱ه-۲ه سیر المتاخرین، ص ص ۴۱-۸۷۰، ۸۳۶

۳ه معاہدہ کی شرائط کے لیے ملاحظہ ہو، AITCHISON کی کتاب Treaties Engagements and Sanads. Vol II P-244

سمجھی کہ نام کے لیے مغل بادشاہت کو برقرار رکھا جائے۔ یہ اور بات تھی کہ انگریزی حکمرانوں نے مغل بادشاہ کی تاریخی اہمیت اور سیاسی قوت کو کمزور کرنے کے لیے، اودھ میں نوابی کو شاہی میں تبدیل کر دیا، آہستہ آہستہ وہ مغل بادشاہ کو زیادہ سے زیادہ شکنجے میں کستے گئے اور بالآخر اُسے بالکل بے دست و پا کر دیا۔ بہادر شاہ ظفرؔ کے عہد میں صورتِ حال یہ تھی کہ بادشاہ نام کا بادشاہ تھا۔ لال قلعہ کے باہر برطانوی کمپنی کی حکمرانی تھی۔ تاہم وہ ہندوستانی عوام کے دلوں کا بادشاہ تھا، وہ اُسی کو اصل حکمران اور کمپنی کی حکومت کو اُس کا ایجنٹ سمجھتے تھے۔ اس کا مظاہرہ ۱۸۵۷ء میں مجاہدین آزادی کے بجنور، بریلی، دہلی، بدایوں، باندہ، جھانسی، کان پور اور الہ آباد میں جاری کردہ اعلانیوں سے ہوتا ہے[1]

یہ بات بہت اہم اور دلچسپ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد جب سر سید نے 'اسباب بغاوت ہند' لکھی تو برطانوی حکومت کے خلاف عوام کی شکایات کا ذکر جو اُنھوں نے صراحت سے کیا ہے وہ کم و بیش وہی ہیں[2] جن کی طرف تقریباً اسّی سال قبل غلام حسین طباطبائی نے انگریزوں کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی تھی، ظاہر ہے پلاسی کی جنگ کے بعد سے ۱۸۵۷ء تک انگریزوں نے ہندوستانی عوام کی شکایات کا کوئی ازالہ نہیں کیا، ردعمل کے طور پر مقامی بغاوتیں شروع ہونے لگیں۔ جیسا کہ اہلِ علم واقف ہیں کہ بنگال میں ۱۷۵۷ء میں سراج الدولہ کی برطرفی اور قتل کے بعد، انگریزوں نے ایک کٹھ پتلی حکومت قائم کر دی تھی۔ اس حکومت کی سربراہی برائے نام میر جعفر کی تھی لیکن پس پردہ انگریزوں کی حکمرانی تھی۔ تبدیلیٔ حکومت کا اثر طبقۂ امراء پر پڑا، چونکہ بنگال میں حکمرانی مسلمان نواب کی تھی اور یوں بھی یہ صوبہ تقریباً پانچ صدی سے مختلف مسلم حکمرانوں کے زیر اثر رہا تھا، اس لیے اس کا بدترین شکار مسلمان ہی ہوئے، مسلمان اپنے تاریخی ماضی اور سیاسی اقتدار کی وجہ سے حکومتِ بنگال میں صدیوں سے

---

[1] سر سید احمد خاں، سرکشی ضلع بجنور، ایڈیٹر شرافت حسین مرزا، ص ص، ۱۷۶، ۱۳۶، وشنو بھٹ، ماجھا پرواس، ایڈیٹر امرت لال ناگر، ص ص ۸۳-۸۲۔ کرنل سلی مین (SLEEMAN) ڈھول پور اور بندیل کھنڈ کے راجاؤں پر اس لیے برہم ہوا کہ ان ریاستوں نے اپنی مُہروں میں یہ کندہ کرایا تھا کہ وہ مسلمان بادشاہ کی قائم کردہ اور غلام ہیں، جب کہ اُن کو انگریزوں نے قائم کیا تھا۔ ملاحظہ ہو Sleeman, Rambles and Recollections P-389

[2] الطاف حسین حالی، حیات جاوید، ص ص، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۷، ۶-۹۰۵، ۷-۹۰۰، ۲، ۹۱۷، ۱۳-۹۱۲، ۳۹۲

نظم ونسق کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتے رہے تھے لیکن نئی برطانوی حکومت کے عہد میں، سیاسی مصلحتوں کے پیشِ نظر اعلیٰ عہدوں پر اُن کی تقرری کم سے کم ہوتی گئی۔ میر جعفر نے اپنی تخت نشینی کے بعد اسّی ہزار سپاہیوں کو، انگریزوں کے اشارہ پر برطرف کر دیا[۱]۔ علاوہ ازیں بہت سے مسلمان خاندانوں کو بطور عطیہ دی جانے والی معاشی مدد، ائمہ جاگیرات اور التمغا جاگیرات کا سلسلہ بھی منقطع ہوگیا۔ بہت سے قدیم مسلمان خاندان، جن کے پاس گذشتہ سلاطین کی عطا کردہ جاگیرات تھیں، نئی حکومت کی زرعی پالیسی کا شکار ہو کر اپنی املاک اور جاگیریں کھو بیٹھے[۲]۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زیادہ حساس اور متاثر افراد نئی حکومت کے خلاف ہتھیار اُٹھانے لگے۔ پلاسی کی جنگ کے بیس سال کے اندر ہی، برطانوی کمپنی کی حکومت کے خلاف سب سے پہلی بغاوت رانو خاں نے چکما اور کوکی قبائل کو منظم کر کے شروع کی۔ برطانوی حکومت جب بغاوت کو فرو کرنے میں ناکام رہی تو اُس نے عیاری سے کام لے کر پہلے دونوں قبائل کے اتحاد کو توڑ دیا۔ کوکیوں کے رہنما جواں بخش کو ورغلایا گیا کہ چکما قبیلہ کے لوگ کوکیوں کی قیمت پر اپنے مفادات کی تکمیل کر رہے ہیں۔ نسلی تعصب کو بھڑکا کر اور جواں بخش کو رشوت دے کر، برطانوی سامراج کے شاطروں نے اتحاد کو توڑ ڈالا۔ رانو خاں، ان ریشہ دوانیوں کا مقابلہ نہ کر سکا اور کہیں روپوش ہوگیا جس کی وجہ سے بغاوت ناکام ہوگئی[۳]۔

رانو خاں اور جواں بخش کی بغاوتیں محدود مسائل کی بنا پر تھیں اور بنگال کے دور افتادہ علاقوں تک محدود تھیں، لیکن یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ بغاوت بنگال ہی میں ہوئی جہاں پہلی بار انگریزوں نے قدم جما کر، دوسرے علاقوں پر دست اندازی شروع کی تھی۔ بنگال

۱۔ Econmic History of Bengal PP 95-96 N.K. Sinha,

۲۔ فرانسس بُکانین An Account of the Districts of Bihar and Patna in 1811-12 pp 561-62

سیر المتاخرین ۱۰۴۱-۸۴۰

۳۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو، Challenge, A Saga of India's struggle for Freedom. ed, Nitish R. Ray and others, New Delhi 1984, PP 122-29

کی دو بڑی خصوصیات ہیں۔ اول یہ بہت زرخیز صوبہ تھا۔ صنعتی طور پر بہت منظم اور عوام خوشحال تھے۔ دوم پورے صوبہ پر مسلمانوں نے کئی صدیوں تک حکومت کی تھی۔ صوبہ کی اکثر آبادی مسلمان تھی چنانچہ تجارت اور اعلیٰ وادنیٰ شہری و فوجی ملازمتوں میں بھی اُن کی اکثریت تھی۔ وہ بہ حیثیت مجموعی ۱۷۰۰ء تک معاشی طور پر خوش حال تھے۔ تبدیلیٔ حکومت نے اس پورے نظام ہی کو درہم برہم کر دیا تھا جس کے نتیجہ میں بغاوتیں اور شورشیں برپا ہونے لگیں۔ رالو خاں اور جواں بخش کی بغاوتوں کا سبب بھی تبدیلیٔ حکومت اور نظام تھا۔

رالو خاں کی بغاوت کے بعد ۱۷۸۳ء میں، بنگال میں ایک بار پھر عوام انگریزی راج کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اس بغاوت کی پشت پناہی کچھ زمین دار بھی کر رہے تھے کیونکہ اُن کی شکایت یہ تھی کہ نئی حکومت کے قیام کے بعد لگان میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا تھا، جو اُن کے وسائل سے باہر تھا۔ اُن کو زبردستی بڑھی ہوئی شرح پر لگان کی ادائیگی کے لیے معاہدوں پر دستخط کرائے جا رہے تھے، وقت پر لگان نہ جمع کرنے کی صورت میں انھیں اُن ہی کی کچہریوں میں قید کر کے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ اُن کو کئی اور نئے ناجائز ٹیکسوں کی ادائیگی پر بھی مجبور کیا جاتا تھا۔[۱]

رعیت پر بھی ناواجب اور اُن کی قوتِ ادائیگی سے زیادہ ٹیکس لگا دئے گئے تھے۔[۲]

بڑی حد تک بنگال کی ابتدائی بغاوتوں کو عوامی بغاوت کہا جا سکتا ہے۔ ہم وثوق سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان بغاوتوں میں علماء کا کیا کردار رہا ہے، قرائن سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اس سلسلہ میں کوئی مخالفت نہیں کی ہوگی۔

جہاں ایک طرف بنگال میں انگریزی سامراجیت کے خلاف لوگوں میں ایک طرح کی بیداری پیدا ہو رہی تھی وہیں دوسری طرف میسور میں شیر میسور، ٹیپو کی قیادت میں مسلمانوں کی آزاد حکومت قائم تھی۔ انگریزوں کے خلاف جذبات موجود تھے۔ ٹیپو سلطان انگریزوں کی شاطرانہ اور مکارانہ چالوں سے بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے انگریزوں کے

۱؎ Narhari Kaviraj, A Peasant uprising in Bengal 1783 p 47-

۲؎ ایضاً ص ۵۰-۵۱۔

خلاف ایک مضبوط محاذ قائم کرنے کے لیے اور مسلمانوں کو منظم اور متحد کرنے کے لیے، جہاد کا نعرہ بلند کیا تھا۔ ٹیپو سلطان نے، ماضی کے مسلمان فرمانرواؤں سے ہٹ کر یہ رائے قائم کی تھی، مسلمانوں پر زوال کا سبب یہ تھا کہ انھوں نے اُن احکامات الٰہی کو بھلادیا جو اُن تک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہونچائے تھے۔ ٹیپو سلطان نے مسلمانوں کی یاددہانی اور اس پر عمل پیرا ہونے کی نیت سے، ۳۰ رمئی ۱۷۸۶ء کو، اپنی دستخط خاص اور مُہر سے دینی احکامات جاری کیے، تاکہ مسلمان ان سے رہنمائی حاصل کریں۔ سلطان نے مسلمانوں کو جہاد میں شامل ہونے کے لیے قرآنی آیات کو بطور سند پیش کیا اور ایک اعلانیہ کے ذریعہ شرع محمدی جاری کرنے کی کوشش کی[1] ہندوستان میں اس کے بعد جو بھی تحریک مسلمانوں نے چلائی، اس میں ہر جگہ 'جہاد' کو بطور موثر حربہ اختیار کیا گیا۔ ۱۸۰۶ء میں، ویلور میں مسلمان فوجی سپاہیوں نے انگریزی حکومت کے خلاف جہاد ہی کا نعرہ بلند کیا تھا[2] گو یہ بغاوت بھی کچل دی گئی لیکن انگریزی حکومت کے خلاف غم وغصہ اور نفرت کی آگ مسلمانوں کے دلوں میں آہستہ آہستہ پھیلتی رہی۔

۱۸۱۰ء میں عبدالرحمٰن نے گجرات کے مشہور شہر سورت میں انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرکے مانڈوی کے قلعہ پر قبضہ کرلیا۔ یہ بغاوت بھی دبادی گئی۔ سورت کی بغاوت کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ عبدالرحمٰن نے بغاوت کو استحکام دینے اور مسلمانوں کی مدد حاصل کرنے کے لیے امام مہدی کا دعویٰ کیا تھا، اس طرح اسے مذہبی رنگ دے دیا گیا تھا۔[3] عبدالرحمٰن کی بغاوت کو مسلمانوں کے علاوہ مراٹھوں کی بھی ہمدردی حاصل تھی کیونکہ ۱۸۰۲ء مراٹھا پیشوا باجی راؤ دوم کے 'ذیلی اتحاد' (Subsidiary Alliance) قبول کرلینے کے بعد، عام طور سے انگریزوں کے خلاف بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔

---

[1] محمود خاں بنگلوری، صحیفہ ٹیپو سلطان، دہلی ۱۹۷۱ء، ص ص- ۵۱۹، ۱۹- ۶۰۹

[2] Evan Balls, Memoires of General Briggs
Cited in Joshi's Rebellion 1857, p-74

[3] S.B. Chaudhri, Civil Disturbances during British Rule in India 1765-1857, p-177

برطانوی حکومت کے بڑھتے ہوئے اقتدار کے خلاف اگرچہ یہ بغاوتیں مقامی نوعیت کی تھیں تاہم ان بغاوتوں کے بانی اور رہنما مسلمان ہی تھے جو اپنے طور پر، ابھرتی ہوئی غیرملکی طاقت کے خلاف اپنے غم وغصہ کا اظہار کر رہے تھے۔ اس کی غالبًا ایک وجہ یہ بھی تھی کہ صدیوں تک مسلمانوں کی سیاسی برتری کی وجہ سے عوام کی نگاہ میں بھی مسلمان ہی رہبری کے اہل تھے۔

آہستہ آہستہ مقامی بغاوتوں نے نیا رخ اختیار کیا۔ اس میں ۱۷۹۳ء کے 'استمراری بندوبست' کے نفاذ کا، جس کا آغاز بنگال سے ہوا، بڑا اہم کردار رہا ہے۔ بنگال کی آبادی میں مسلمان اکثریت میں تھے لیکن اٹھارہویں صدی عیسوی کی ابتدا سے (مرشد قلی خاں) لے کر میر جعفر کے دورِ اقتدار تک، بنگال میں زمین داری کے نظام میں زبردست تغیر آنے کی وجہ سے، قدیم زمین دار، جن کی اکثریت مسلمانوں کی تھی، برباد ہو گئے۔ استمراری بندوبست بھی زرعی نظام میں ایک تجربہ ہی تھا، اس کے تحت زمین کی ملکیت دائمی طور پر اُن افراد کے حق میں تسلیم کر لی گئی، جن کا بندوبست کے وقت قبضہ تھا۔ یہ اقدام بغیر کسی تفتیش کے اُٹھایا گیا اور نہ ہی یہ معلوم کرنے کی کوشش کی گئی کہ زمین کا قانونی طور پر کون وارث ہے[1]۔ استمراری بندوبست کا بہت بُرا اثر بنگال، بہار اور اڑلیسہ کے طبقہ امرا اور اُن کے اخلاف پر پڑا[2]۔ یہ طبقہ پہلے ہی نظامت کے خاتمہ کی وجہ سے مشکلات سے دوچار تھا۔ رعیت تو ۱۷۶۵ء ہی سے تباہ حالی کا شکار تھی، کیونکہ اجارہ داری کے نظام کی وجہ سے اُن پر لگان کا بوجھ کئی گنا بڑھ گیا تھا[3]۔ مزید برآں ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدہ داروں نے ۱۷۶۵ء میں مقرر کردہ بنگال کے نواب کے الاؤنس کی رقم ترپن لاکھ چھیاسی ہزار روپیوں سے گھٹا کر ۱۷۷۲ء میں صرف سولہ لاکھ روپیے کر دی جس کی وجہ سے کثیر تعداد میں وہ لوگ متاثر ہوئے جو نواب کے ذاتی ملازم تھے۔ بیکاری کا شکار یہ لوگ، جن میں سپاہی، زمین داروں

۱۔ Badan Powel, A Short Account of the Land Revenue and its Administration in India, Londan 1894 Vol. I p-407

۲۔ A.R. Mallick, British Policy and the Muslims in Bengal, Dacca 1977, p-38. Buchanan's, Account of the Districts of Bihar & Patna, pp 561-62

۳۔ Economic Annals of Bengal pp. 97-98

کی ملازمت میں ہتھیار بند اور لاٹھی بردار اور بہت سی جگہوں پر زمین دار، ضروریات زندگی کی تکمیل کے لیے ڈاکو اور راہزن بن گئے۔ گو کہ ڈکیتوں اور رہزنی کی روک تھام کمپنی کی حکومت نے کردی لیکن عوام کی بے چینی نے منظم بغاوت کی شکل اختیار کرلی۔

رعیت پر ایک نئی افتاد نیل کے یورپین تاجروں کے بڑھتے ہوئے اثرات اور ظالمانہ سلوک کی شکل میں پڑی۔ نیل کے یورپین تاجروں کی بھرپور اعانت، سیاسی اور مالی مفاد کے پیش نظر، حکومت وقت کر رہی تھی۔ بنگال کی رعیت ان ظالموں کے جور و ستم کا شکار ہو رہی تھی۔ ان حالات میں حاجی شریعت اللہ[1] نے ان ظالموں کے خلاف رعیت کو منظم کیا۔ حاجی شریعت اللہ صاحب کے سامنے دو بڑے اور اہم مسئلے تھے۔ اول یہ کہ بنگال کے مسلمانوں کی اکثریت اسلام سے والہانہ عقیدت اور احترام کے باوجود مشرکانہ اور بدعتی رسم و رواج کا شکار تھی۔ قدیم زمین داروں کی تباہی کے بعد نئے زمین دار بیشتر غیر مسلم تھے۔ ان کے اثرات کے تحت اور برطانوی حکومت کے جابرانہ رویہ کی وجہ سے، عام طور سے مسلمان رعیت پست ہمتی، غربت اور خوف و ہراس میں مبتلا تھی۔ مسلمانوں کو اس قعر مذلت سے نکالنے کے لیے ضروری تھا کہ اُن کو دین کی صحیح تعلیمات سے روشناس کرایا جائے[2]۔ حاجی صاحب نے مسلمانوں کو قرآن اور حدیث کی روشنی میں فرائض پر قائم رہنے کی تلقین کی۔ حاجی صاحب کی کوششیں بارآور ہوئیں اور مختصر عرصہ میں سیکڑوں کی تعداد میں رعیت اُن کے جھنڈے تلے جمع ہوگئی۔ ہر چند کہ حاجی شریعت اللہ صاحب کی تحریک پر مذہب غالب تھا لیکن اس کا سیاسی نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے پیرو کار رعیت نے سرکار اور خصوصاً زمین داروں کے ناجائز اور غیر قانونی ٹیکسوں کی ادائیگی بند کردی[3]۔ حاجی صاحب کی تحریک کا جب مثبت نتیجہ نکلنا شروع ہوا تو نیل کے

---

[1] آپ بندر کھولا، ضلع فرید پور کے باشندہ تھے۔ کم عمری میں حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے، مکہ میں بیس سال تک قیام رہا۔ وہاں آپ شیخ طاہر مکی کے مرید ہوئے۔ ہندوستان لوٹنے کے بعد فرید پور سے اپنی اصلاحی تحریک کا خاموشی سے آغاز کیا۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو۔ اے۔ آر ملک ص ص ۸۳-۸۷۔

[2] اے، آر، ملک، ص ص۔ ۸۳-۷۹۔

[3] اے، آر، ملک نے ان ٹیکسوں کی تفصیلات دی ہیں، ان میں داڑھی رکھنے پر ٹیکس، شادی، ولادت درگا پوجا، دسہرہ وغیرہ کے ٹیکس بھی وصول کیے جاتے تھے۔ ملاحظہ ہو، صفحات ۸۴—۸۰

تاجران اور زمین دار بوکھلا گئے۔ اُن کی تحریک کو فرقہ وارانہ، اور سرکار مخالف قرار دینے کی کوشش کی گئی۔ حاجی صاحب کو جعلی مقدمہ میں ملوث کر کے سزا دلانے کی ناکام کوشش کی گئی۔ حاجی صاحب کے انتقال کے بعد تحریک کی قیادت، جواب فرائضی تحریک کے نام سے مشہور ہو چکی تھی، اُن کے فرزند دودو میاں نے سنبھالی۔ دودو میاں نے تحریک میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اُن کا اعلان تھا کہ زمین اللہ کی ملکیت ہے اور جو اس پر ہل چلاتا ہے وہی اس کی پیداوار کا حق دار ہے۔ دُودو میاں نے یہ بھی اعلان کر دیا کہ زمین کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہے اور نہ ہی اُس پر کوئی ٹیکس عائد کیا جا سکتا ہے[1]۔ دودو میاں کے انقلابی اعلانات کی وجہ سے ایوان حکومت اور زمین داروں کے اندر ہیجان اور اضطراب پیدا ہو گیا۔

فرائضی تحریک کو حکومت اور ہندو زمین داروں نے فرقہ وارانہ رنگ دے دیا حالانکہ یہ تحریک فرقہ وارانہ نہیں تھی[2]۔ تحریک کا آغاز برطانوی حکومت اور زمین داروں کے استحصال کی پالیسی کی وجہ سے ہوا تھا۔ فرائضی تحریک میں شامل مجاہدین کا نشانہ ظالم اور جابر زمین دار تھے ان میں کوئی مذہبی تفریق نہیں تھی[3]۔ فرائضی تحریک کا اصل ہدف انگریز تھے۔ دُودُو میاں کے پرچم تلے تقریباً ۸۰ (اسّی) ہزار مسلمان جمع ہو چکے تھے ان میں اکثریت رعیت اور دستکاروں کی تھی، کیوں کہ برطانوی حکومت کے قیام کے بعد یہی لوگ سب سے زیادہ تباہ ہوئے تھے۔ Dampier (ڈیمپیر) سپرنٹنڈنٹ پولس بنگال لکھتا ہے کہ فرائضیوں کا اصل مقصد برطانوی حکومت کی تباہی اور مسلم حکومت کا قیام تھا[4]۔ یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کیونکہ تحریک کے ایک اور قائد ٹیٹو میر کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ وہ قبائلی کول کی بغاوت (۱۸۳۱ء) کے اہم رکن تھے[5]۔

---

[1] اے، آر، ملک، ص ص۔ ۹۰۔۸۰

[2] W.W. Hunter, The Indian Musalmans 1969, p-101

[3] ہنٹر، ص۔ ۱۰۱

[4] Selections from the Records of Bengal p-141

[5] N.R. Ray (ed) Challenge, A Saga of India's Struggle for Freedom N. DELHI 1984 pp. 122-29

یہاں یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ نہ تو حاجی شریعت اللہ نے اور نہ ہی ان کے پیروکاروں نے برطانوی حکومت کے خلاف جدوجہد کو جہاد قرار دیا، تاہم اس پوری تحریک میں بلاواسطہ یہ تصور غالب تھا اور فرائضی اس جنگ میں کام آنے کو درجۂ شہادت سمجھتے تھے۔

فرائضی تحریک کا دائرۂ کار اور اثرات بنگال تک محدود رہے۔ انیسویں صدی کی ابتدا میں، ایک بے حد موثر اور کامیاب تحریک سید احمد شہید کی قیادت میں شروع ہوئی، جس کو بدنام کرنے اور خود مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کی غرض سے اسے "وہابی تحریک" کا نام دیا گیا۔[1]

سید احمد بریلوی اپنی ابتدائی تعلیم رائے بریلی میں مکمل کرنے کے بعد، شاہ ولی اللہ کے قائم کردہ مدرسہ رحیمیہ میں تعلیم حاصل کرنے دہلی پہونچے۔ اُن کے قیام دہلی میں ہی ۱۸۰۳ء میں انگریزوں نے دہلی پر اقتدار حاصل کرلیا تھا جس کے نتیجہ میں شاہ عبدالعزیز اور مولوی عبدالحیٔ کے مشہور فتاویٰ جاری ہوئے تھے جس کی رو سے ہندوستان دارالاسلام باقی نہیں رہا تھا۔ ان فتووں نے برطانوی حکومت کے خلاف جہاد کے لیے شرعی طور سے راہیں ہموار کر دی تھیں[2]۔ سید صاحب کا بنیادی مقصد ہندوستان سے انگریزوں کا اخراج تھا[3] اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے اُنھوں نے مسلم معاشرہ کی اصلاح، ایک تنظیم کے قیام، قرآن اور حدیث کی تعلیمات کو مزید رواج دینا اور جہاد کے لیے ضروری اور بنیادی فوجی تربیت حاصل کرنا ضروری سمجھا۔

سید احمد بریلوی مزاجاً خاموش طبع تھے۔ آپ ایک مدبر اور دوراندیش رہنما تھے۔ جہاد کے لیے جہاں افراد کی ضرورت تھی وہیں مستقل وسائل اور ایک محفوظ مقام کی بھی ضرورت تھی جسے مستقر بنا کر تحریک کا آغاز کیا جا سکے۔ ہندوستان کی سیاسی

---

[1] ایک جدید تاریخ نگار Avrill Ann Powell, لکھتا ہے کہ ۱۸۰۳ء کے بعد کی تحریروں میں شاہ عبدالعزیز کا رویہ رواداری کا تھا۔ ملاحظہ ہو Muslim and Missionories in Pre-Mutiny India Surrey 1993 p-72.

[2] سید ابوالحسن ندوی، سیرت سید احمد شہید، جلد اول، ص ص ۹۰ - ۳۸۹، غلام رسول مہر، جماعتِ مجاہدین، ص ص ۱۴-۱۳۔

[3] سیرت سید احمد شہید، جلد اول، ص ص ۹۰ - ۳۸۹، قیام الدین احمد، ص ص ۶۶ - ۳۶۵۔

تبدیلیوں، اس کے اثرات اور مسلمانوں کے بچے کھچے طبقہ امرا سے بھی وہ بخوبی واقف[2] تھے۔ انگریزوں کی ریشہ دوانیوں سے بھی وہ ناواقف نہیں تھے[1] ایک تجربہ کار فوجی کی طرح وہ یہ بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ کس طرح ماضی میں مسلمانوں اور ہندو والیان سلطنت کی انگریزوں کے خلاف حربی جدوجہد ناکام رہی تھی اور اس کی بہترین مثال شیر میسور ٹیپو سلطان کی تھی۔ ہندوستان میں انگریزوں کا مکمل تسلط قائم ہو چکا تھا اور ایسی صورت حال میں، ہندوستان کی سرزمین کسی بھی حربی تحریک کے لیے مناسب نہیں تھی۔ انگریز بآسانی تحریک کو ختم کر دیتے۔ تمام نشیب و فراز پر غور کرنے کے بعد سید احمد بریلوی نے تحریک کا مستقر، شمالی ہند کے سرحدی علاقہ میں قائم کیا۔ اس کے دو اہم پہلو تھے۔ فوجی نقطۂ نظر سے سرحد کا پورا علاقہ جنگ جو پٹھان مسلمانوں کے زیر اثر تھا۔ یہاں ایک اچھی فوج منظم کی جا سکتی تھی۔ دوم، بغیر کسی مداخلت کے، اس علاقہ کے عوام کو آسانی کے ساتھ تحریک میں شامل کیا جا سکتا تھا کیونکہ سکھوں کے پنجاب اور سرحد سے ملحق علاقہ جات میں مظالم کی داستان سے سرحدی عوام غم و غصہ میں تھے۔ انھیں قائد کی ضرورت تھی۔

حالات کے پیش نظر سید احمد بریلوی نے تحریک کا آغاز شمالی مغربی سرحد سے کرنے کا فیصلہ کیا، لیکن تحریک کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے، پٹھانوں کی اصلاح بھی ضروری تھی۔ اُن کے اندر قبائلی عصبیت، خون خرابہ، اور مذہب سے بیگانگی کی وجہ سے بہت سی خرابیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ سید احمد شہید نے، پٹھانوں کی تربیت کے لیے قاضیوں کی تقرری کی۔ جا بجا معلمین اور پیش امام مقرر کیے گئے۔ خون خرابہ کے بجائے قاضیوں کی عدالت سے رجوع کرنے کی حوصلہ افزائی کی گئی، قرآن اور حدیث کی روشنی میں حرام اور حلال میں امتیاز کرنے کی تلقین کی گئی۔ غیر شرعی امور سے گریز کرنے پر زور دیا گیا، صرف اُن ٹیکسوں کے نفاذ پر زور دیا گیا جو قرآن سے ثابت تھے، معمولی تاجروں، رعیت اور دستکاروں پر ٹیکس عائد کرنا، غیر اسلامی طریقہ بتایا گیا۔ اصلاح معاشرہ کے بعد، پٹھانوں

---

[1] قیام الدین احمد، دی وہابی مومنٹ۔ ص ۶۶ - ۳۶۵

[2] انھوں نے امیر خاں، نواب ٹونک کے فوجی رسالہ میں تقریباً آٹھ سال تک کام کیا تھا۔

کی بڑی تعداد، سید احمد شہید کی تحریک سے وابستہ ہوگئی۔ سید احمد کی قیادت میں سکھ حکومت کے خلاف محاذ آرائی شروع ہوئی۔ مجاہدین نے بے سروسامانی کے باوجود ہمت اور استقلال سے، سکھوں کی فوج پر کئی یورشیں کیں، پشاور پر قبضہ کرلیا، لیکن جلد ہی سکھ افواج کے دباؤ کی وجہ سے انھیں شہر چھوڑنا پڑا۔ اس حربی جدوجہد کو شدید دھکا اس وقت لگا جب مئی ۱۸۳۱ء میں، سید احمد بریلوی دغابازی اور غداری کا شکار ہو کر شہید کردیئے گئے[۱] سید صاحب کی شہادت، تحریک کے لیے بڑا صدمہ تھا، سید احمد شہید کے جانثاروں نے بہرحال تحریک کو جاری رکھا۔[۲]

سکھوں کی حکومت رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد، انگریزوں کی ریشہ دوانیوں کا شکار ہو کر دم توڑ گئی۔ پنجاب پر انگریزوں کی براہِ راست حکمرانی قائم ہونے کے بعد، سید احمد شہید کی تحریک کا رخ فطری طور پر انگریزوں کی طرف ہوگیا۔ مجاہدین نے سرحدی علاقوں میں، مقامی باشندوں کی مدد سے تحریک کو جاری رکھا، اور چالیس برس تک، برطانوی حکمرانوں کے لیے بہت بڑا چیلنج بنے رہے۔[۳]

سید احمد شہید کی تحریک سے چند برس پہلے، بریلی کے ممتاز اور مقتدر مفتی محمد عیوض نے انگریزی حکومت کے خلاف مسلمانوں کو منظم کیا تھا۔ مفتی صاحب، بریلی اور اطراف کے علاقوں میں بہت عزت و احترام سے دیکھے جاتے تھے، غالباً اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ روہیلوں اور انگریزوں کی حکومتوں میں بدستور اپنے منصب پر فائز رہے۔ حافظ رحمت خاں نے اپنے دورِ حکومت میں مفتی صاحب کو بریلی میں اس عہدہ پر فائز کیا تھا۔ حافظ رحمت خاں والی اودھ، انگریزی گورنر جنرل وارن ہسٹنگز کی سازشوں کا شکار ہو کر ۱۷۷۴ء میں شہید ہو گئے تھے۔[۴] ۱۸۰۱ء میں

۱۔ اے۔ آر۔ ملک ص ۱۲۵، قیام الدین احمد، ص ۴۳۔

۲۔ اے۔ آر۔ ملک، ص ص ۱۳۲۔ ۱۲۵۔

۳۔ تارا چند، فریڈم موومنٹ اِن انڈیا، جلد دوم، ص ص، ۳۰۔ ۲۷، قیام الدین احمد، ص ص ۲۰۹۔۱۷۸

۴۔ سید الطاف بریلوی، حیات حافظ رحمت خاں، کراچی ۱۹۶۳ء ص ص۔ ۸۵۔ ۲۲۷، مستجاب خاں گلستانِ رحمت، علی گڑھ مخطوطہ، ص ۲۱۶ الف۔

۴۰۱

روہیل کھنڈ پر انگریزوں کا تسلط قائم ہو گیا تھا مگر مفتی صاحب بدستور اپنے عہدہ پر قائم رہے ۱۸۱۶ء میں وہ خاصے معمر تھے۔ روہیل کھنڈ کے مسلمان انگریزوں سے شدید نفرت کرتے تھے کیونکہ اُنھوں نے اُن کے محبوب حکمراں حافظ رحمت کے خلاف سازش کی تھی۔ وہ ۱۷۷۴ء کی جنگ حافظ رحمت خاں کی شہادت اور بڑی تعداد میں روہیلوں کی ملک بدری کو فراموش نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے دلوں میں انگریزی حکومت کے خلاف اندر ہی اندر آگ دہک رہی تھی ستم برآں انگریزوں نے روہیل کھنڈ پر قبضہ کر لینے کے بعد اپنے قوانین نافذ کرنے شروع کر دیئے تھے۔ ۱۸۱۲ء میں لگان میں اضافہ کر کے روہیل کھنڈ کی رعیت کی مشکلات میں شدید اضافہ کر دیا گیا تھا[۱]۔ دو سال بعد ۱۸۱۴ء میں انگریزوں نے روہیل کھنڈ کے عوام پر چوکیداری ٹیکس لگا دیا۔ روہیل کھنڈ کے مختلف علاقوں میں عوام نے اس ٹیکس کے نفاذ پر احتجاجات کئے۔ بریلی کے عوام نے بھی حکومت سے اس ٹیکس کو واپس لینے کا مطالبہ کیا، بریلی کے حکام نے جبری وصولی کے احکامات جاری کیے جس کی وجہ سے عوام اور حکومت کے اہل کاروں کے مابین ٹکراؤ ناگزیر ہو گیا۔ مفتی صاحب نے اس جبری وصولی کے خلاف عوام کو یکجا کیا اور احتجاج نے جہاد کی شکل اختیار کر لی۔ دراصل مفتی صاحب نے عوام کے استفسار پر یہ رائے دی تھی کہ چوکیداری ٹیکس کا نفاذ ایک طرح سے مسلمانوں پر جزیہ عائد کرنا ہے۔ اس فتویٰ کے بعد عوام نے ٹیکس ادا کرنے سے انکار کر دیا[۲]، اور حکومت سے چوکیداری ٹیکس واپس لینے کی درخواست کی۔ عوام کی درخواست کے جواب میں ضلع مجسٹریٹ نے درشت اور غیر مہذبانہ رویہ اختیار کیا جس کی وجہ سے حالات اور خراب ہو گئے۔ ٹیکس کی جبری وصولی کے لیے ایک ظالم اور بدنام زمانہ غیر مسلم اہلکار کو مقرر کیا گیا۔ مفتی صاحب نے اس کی شدت سے مخالفت کی، نتیجہ میں نہتے اور پر امن مظاہرین پر گولیاں چلا دی گئیں،

---

۱ Atkinson. Statistical and Discriptive Account of N W P Vol. V p.676. صدیق حسن، تاریخ قنوج، علی گڑھ مخطوطہ، جلد اول ص ۴۷-۴۶

۲ Marquis of Hastings. The Private Journal... Allahabad 1907 pp 249-50

تاریخ قنوج، ص ص ۴۷-۴۶

۴۰۲

سات افراد جاں بحق اور بہت سے زخمی ہو گئے۔[1] اس پس منظر میں مفتی صاحب نے جہاد کا فتویٰ صادر کیا۔ مفتی صاحب کے فتویٰ جاری کرنے کے بعد بریلی اور اطراف و جوانب کے مسلمانوں نے لبیک کہا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پانچ ہزار روہیلہ پٹھان، تلوار اور آتشیں ہتھیاروں سے لیس ہو کر مفتی صاحب کے گرد جمع ہو گئے۔ ۱۸ اپریل ۱۸۱۶ء کو یہ تعداد بڑھ کر بارہ ہزار ہو گئی۔[2] پیلی بھیت، شاہجہاں پور، مراد آباد، رام پور کے پٹھان بھی ہتھیاروں سے لیس ہو کر بریلی کی طرف کوچ کرنے کو تیار تھے۔ مقامی حکام نے صورت حال کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے فریب کی راہ اختیار کی تاکہ باہر سے مدد آ سکے۔ ۱۸ اپریل کو فوجی امداد ملتے ہی اچانک مجاہدین پر حملہ کر دیا۔ دو سو افراد اس حملہ میں جاں بحق ہو گئے اور بہت سے مجروح۔ اس جدوجہد کو بھی فوجی طاقت استعمال کر کے کچل دیا گیا۔ مارکوئیس ہسٹنگز لکھتا ہے کہ اگر دو دنوں تک یہ بغاوت اور جاری رہتی تو پورا روہیل کھنڈ انگریزوں کے خلاف ہتھیار بند ہو کر صف آرا ہو گیا ہوتا۔[3] ممکن ہے کہ مفتی عیوض صاحب کے فتویٰ جہاد سے بعض لوگوں کو اختلاف ہو۔ اگر روہیل کھنڈ کی تاریخ اور وہاں کے عوام کے جذبات کو سامنے رکھا جائے تو اس سے اختلاف مشکل ہے۔

۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی سے پہلے احمد اللہ شاہ[4] کی شخصیت بھی بڑی اہم نظر آتی ہے۔ آپ شاہ محراب علی گوالیار کے مرید تھے اور خیال یہ کیا جاتا ہے کہ اُن کے پیر نے ہی ان کو جہاد کی تلقین کی تھی۔[5] یہ بات قرین قیاس ہے کیونکہ سید احمد بریلوی اسی راستہ سے گذرے تھے۔ گوالیار میں قیام کے دوران آپ نے وہاں کے مقتدر مراٹھا، ہندو راؤ سے بھی مہم کے لیے مدد مانگی تھی۔[6] ممکن ہے کہ اسی دوران محراب علی شاہ اور

---

[1] The Prive Journal pp 249-50.

[2] The Private Journal pp 249-50 ، تاریخ قنوج، ص ص ۴۷، ۴۶۔

[3] The Private Journal p.p. 250-52

[4] حیات اور کارناموں کے لیے، ملاحظہ ہو، ابرار حسن فاروقی، ماثر دلاوری، انتظام اللہ شہابی، ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء، تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، اپریل۔جون ۱۹۸۹ء، ۱۰۳ - ۷۶

[5] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء، ص ۱۹ ۔

[6] سیرت سید احمد شہید، ص ص ۹۰ - ۳۸۹ ، قیام الدین احمد، ص ص ۶۶ - ۳۶۵ ۔
۳۰۴

سید احمد بریلوی سے ملاقات ہوئی ہو۔ بہر حال احمد اللہ شاہ کی سرگرمیوں کے متعلق ہمیں کافی معلومات ملتی ہیں۔ آپ گوالیار سے آگرہ آئے، وہاں محفل سماع (جسے بعض شرائط کے ساتھ جائز سمجھا جاتا ہے) میں کثیر تعداد میں مسلمان اور ہندو دونوں شریک ہوتے تھے، احمد اللہ شاہ کی ان تقریبات پر انگریزوں کی نظر تھی، انھیں آگرہ چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا، آپ وہاں سے اودھ کی طرف روانہ ہوئے۔ دریں اثنا اجودھیا میں، ہنومان گڈھی میں واقع مسجد کی شہادت کا واقعہ پیش آچکا تھا۔ سید امیر علی اور اُن کے رفقا، اس قضیہ میں شہادت پا چکے تھے۔ اودھ میں مسلمانوں میں ہنومان گڈھی کے واقعہ کی وجہ سے شدید غم وغصہ تھا، انگریزوں نے دریں اثنا، اودھ کے حکمراں نواب واجد علی شاہ کو معزول کر کے براہ راست انگریزی حکومت قائم کر دی تھی، اودھ کے عوام اور خواص، بلا لحاظ ملت اور مذہب انگریزوں سے بہت ناراض تھے۔ تقریباً اسی ماحول میں، نومبر ۱۸۵۶ء کو احمد اللہ شاہ لکھنؤ میں وارد ہوئے[1] احمد اللہ شاہ نے یہاں براہ راست لوگوں کو جہاد کے لیے آمادہ کرنا شروع کیا، اودھ میں واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد وہی کہانی دہرائی گئی، جو تقریباً ایک صدی پہلے، بنگال میں، پلاسی کی جنگ کے بعد رچی گئی تھی۔ واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد تقریباً ۸ ہزار افراد بیکار ہو گئے تھے جن کی پرورش نواب واجد علی شاہ کی سرکار سے ہوتی تھی، اُن کی تنخواہوں پر تقریباً ۸۲ لاکھ روپئے خرچ ہونے تھے۔ واجد علی شاہ کی معزولی کا نقشہ کمال الدین حیدر کچھ اس طرح پیش کرتا ہے:۔

> "جب سے یہ ہنگامہ (انتزاع اودھ) برپا ہوا تھا اکل وشرب انسانی گم ہو گیا تھا مگر بے خبر محافظان دواب سے حیوانات بے زبان کو بھی کئی دن سے خوراک یومیہ میسر نہ ہوئی تھی، جب یہ خبر مشروعًا چیف کمشنر کو پہونچی پرچہ پیام آیا کہ یہ حیوانات روز وشب کے فاقہ سے مر جائیں گے لہٰذا مناسب ہے کہ جو اونمیں سے بہتر ہوں منتخب کیے جائیں باقی سب کا حکم نیلام دیا جائے"
> کمال الدین حیدر مزید لکھتے ہیں: "چیف کمشنر نے پہلے کاغذ جمع خرچ کارخانجات سلطانی اور ملازمین شاہی کا جائزہ لیا۔ چنانچہ سب مجموع تراسی لاکھ

---

[1] ہفتہ وار طلسم، لکھنؤ، ۲۱ر نومبر ۱۸۵۶ء۔

روپیہ تنخواہ ملازمین و اقربائے شاہی کا مع کارخانجات نکلا۔ سوائے خرچ
ضروریات ذات اقدس و خرید اسباب جدید وغیرہ اور ۷۔۸ ہزار آدمی سب
مجموع ملازم ہر فرقہ و سپاہ کے تھے، چنانچہ بعد برطرفی چہارم فوج زماں
خلد منزل فردوس منزل حضرت جنت مکان کے ۵۲ بٹالین نجیب
و تلنگہ اور ساڑھے تین ہزار سوار سوائے ترکسو داران سواری" [۱]

واجد علی شاہ کی معزولی کا انجام یہ ہوا کہ تقریباً دس لاکھ کی بھری پری خوش آبادی کا شہر لکھنو ویران ہو گیا۔ اس کی آبادی چند برسوں میں گھٹ کر صرف تین لاکھ رہ گئی۔ بہت سے لوگ بے کاری اور مفلسی سے بچنے کے لیے دوسرے مقامات پر چلے گئے اور جو لوگ کسی وجہ سے ترک وطن نہ کر سکے، مفلوک الحالی اور فقر و فاقہ کا شکار ہو گئے۔[۲] واجد علی شاہ کی معزولی کا وہی اثر اودھ پر پڑا تھا جو بنگال میں پلاسی کی جنگ اور انگریزوں کے برسر اقتدار آنے کے بعد وہاں کے عوام پر پڑا تھا۔ اودھ میں بھی عوام نئے حکمرانوں کے ہاتھوں تباہ ہو رہے تھے۔ احمد اللہ شاہ کے لیے، اس صورتِ حال میں، عوام کو منظم کر کے جہاد پر مستعد کر دینا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ اُن کے پیغام کا لوگوں نے خیر مقدم کیا۔ اُنھوں نے احمد اللہ شاہ کی قیادت میں انگریزوں کے خلاف ۱۸۵۷ء میں ایک دلیرانہ اور بہادرانہ جنگ لڑی لیکن انگریزوں کی فوجی طاقت اور "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی کے مقابلے میں احمد اللہ شاہ اور اُن کے رفقاء نہ ٹک سکے۔ بالآخر شاہ صاحب کو انگریزوں کے ایک پٹھو، پوائن کے راجہ نے فریب سے بلا کر شہید کر دیا۔[۳]

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ بہادر شاہ ظفر، بیگم حضرت محل، شاہزادہ فیروز بخت، نانا صاحب، جھانسی کی رانی اور مولوی لیاقت علی نے جو اعلانے مجاہدین آزادی کو جاری کیے ان میں 'جہاد' پر خاص توجہ دی گئی تھی۔[۴] ۱۸۵۷ء کی جنگ

---

[۱] کمال الدین حیدر، سوانح سلاطین اودھ، ص ص ۵۲-۵۱ اور ۱۷۰-۱۷۱، آئندہ بحوالہ کمال الدین حیدر۔

[۲] کمال الدین حیدر، ص ص ۵۲-۵۱۔

[۳] تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو، ماثر دلاوری، تحقیقات اسلامی۔

[۴] S.A.A. Rizvi Freedom Struggle in Uttar Pradesh Vol - 1 p.p.438-39 455-58.

میں جو علماء کرام پیش تھے ان کی فہرست بہت طویل ہے۔ مولانا قاسم نانوتوی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، شاہ امداد اللہ مہاجر مکی، علامہ فضل حق خیر آبادی، مولوی سرفراز علی گورکھپوری، مولانا عبدالقادر، قاضی فیض اللہ دہلوی، مولانا فیض احمد بدایونی، مولانا محمد علی مونگیروی، ان میں قابل ذکر ہیں، مولوی سرفراز علی کی کوششوں سے بخت خاں روہیلہ جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے پہلے، بنگال آرمی میں، صوبیداری کے عہدہ پر فائز تھے، مجاہدین کی صف میں شامل ہو کر کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ ڈاکٹر وزیر خاں جو رد عیسائیت میں مولانا کیرانوی کے ساتھ تھے، جنگ آزادی کے ایک اہم رکن تھے۔

علمی اور مذہبی جدوجہد

یہاں عیسائی مشنریوں کی سرگرمی کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ تاریخی شواہد کے اعتبار سے شمالی ہند میں عیسائی مشنریوں کی آمد اکبر کے عہد میں ہوئی۔ عبادت خانہ کی مذہبی مجلسوں میں عیسائی علماء بھی شریک ہوتے تھے۔ عبادت خانہ کے مذاکرے بتدریج مناظروں میں تبدیل ہوتے گئے۔ مغل دور حکومت میں عیسائی مشنریز اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے لیکن وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو تبدیلیٔ مذہب پر مائل کرنے میں ناکام رہے تھے۔ ۱۷۵۷ء میں انگریزوں کے تسلط کے بعد عیسائی مشنریز کا فروغ ہوا۔ انیسویں صدی عیسوی میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے عیسائی مبلغین کو اشاعت عیسائیت کی پوری اجازت دیدی بہت سے عیسائی مبلغین ہندوستان آئے ان میں ایک اہم عیسائی پادری فینڈر تھا۔ فینڈر نے مروجہ یورپی علوم کی تحصیل کے ساتھ عربی، فارسی زبانوں میں بھی مہارت حاصل کی۔ عیسائی مذہب کی تبلیغ کے لیے، یورپ اور ایشیا کے مختلف ممالک میں پھرتا رہا۔ اس نے اسلام اور عیسائیت پر کئی کتابیں تصنیف کیں۔ وہ آرمینا کے عیسائی اور مسلمانوں کے درمیان رہ کر مسلمانوں کو عیسائی مذہب قبول کرنے کی کئی برس تک ناکام کوششیں کرتا رہا۔ وہ میسوپوٹامیہ اور ایران بھی گیا۔ ہر جگہ وہ مسلمانوں کو عیسائیت کی طرف مائل کرنے میں ناکام رہا، پے در پے ناکامیوں کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ مسلمان قرآن مجید کی حقانیت پر ایمان رکھتے ہیں اس میں انجیل مقدس کی برتری اور عیسائیت کی فوقیت پر جو بھی بحث ہوگی ان پر بے اثر ہوگی۔[1] بالآخر اُس نے اپنے خیالات کی ترجمانی کے لیے، اپنے تئیں، ایک مدلل

---

[1] Muslim and Missionories p.p. 138-39

کتاب جرمن زبان میں تحریر کی جس کا ترجمہ ۱۸۳۱ء میں آرمینی زبان میں شائع ہوا۔ بعد میں اس کا ترجمہ "میزان الحق" کے نام سے فارسی زبان میں بھی شائع ہوا[1]۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد ہندوستان میں ایک بار پھر اسلام اور عیسائیت کی حقانیت پر مناظرے کے دروازے کھول دیے، کہا جاتا ہے کہ ۱۹ ویں صدی عیسوی میں پہلا مناظرہ، عیسائیوں اور شاہ عبدالعزیز کے درمیان ہوا[2]۔ آہستہ آہستہ عیسائی پادریوں اور مسلمان علماء کے درمیان اکثر مناظرے ہونے لگے۔ فینڈر نے چن چن کر مسلمانوں کے سرکردہ افراد جن میں سید احمد خاں (بعد کے سرسید) کاظم علی سجادہ نشین شیخ سلیم چشتی، سید نورالحسن وغیرہ قابل ذکر ہیں مناظروں پر اکسایا، عیسائیت کی تبلیغ کے لیے عربی اور فارسی زبانوں میں مطبوعہ انجیل بھیج کر اُس پر اُن کی رائے طلب کی اور عیسائیت اور اسلام پر مناظرہ کی تجویز پیش کی۔ یہ تجویز عیسائیت کی اشاعت کے مقصد سے رکھی گئی تھی۔ فینڈر کو یقین تھا کہ ہندوستان میں کوئی مسلمان عالم دین اُس کے سامنے ٹک نہیں سکے گا۔ مگر ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی زوال کے باوجود، علمی طور اُن کی بنیادیں مضبوط تھیں۔ ملک کے مختلف گوشوں میں تمام مشکلات کے باوجود بے شمار مدرسے خاموشی سے دینی خدمات میں لگے ہوئے تھے۔ مدارس سے فارغین کی بڑی تعداد موجود تھی جو نہ صرف علوم قرآن و حدیث سے بہرہ ور تھے بلکہ توریت اور انجیل پر بھی بہت اچھی نظر رکھتے تھے۔ وہ کسی بھی ایسے مناظرہ کے لیے تیار تھے۔ فینڈر، اپنی عیسائی نوازی اور عیسائی پرستی کی وجہ سے مدارس و مساجد سے لے کر بازاروں تک میں مسلمانوں کی گفتگو کا مرکز بن گیا تھا۔ پہلا نام جس نے فینڈر کو لاجواب کر دیا وہ پروفیسر سید نورالحسن[3] صاحب کا تھا۔

---

[1] پادول کے مطابق "میزان الحق" کے دو ایڈیشن کلکتہ اور آگرہ سے ۱۸۳۹ء اور ۱۸۴۹ء میں شائع ہوئے تھے۔ اس کا پہلا اردو ترجمہ ۱۸۴۳ء میں مرزاپور سے اور ۱۸۵۰ء میں آگرہ سے شائع ہوا Muslim and Missionories p.p. 138-39.

[2] امداد صابری، فرنگیوں کا جال، دہلی ۱۹۴۷ء ص ۱۳۷، پادول اس واقعہ کو مناظرہ تسلیم نہیں کرتا۔ Muslim and Missionories p.104

[3] پورا نام سید محمد نورالحسن تھا۔ آپ اینگلو اورنٹیل کالج دہلی کے شعبہ عربی کے ہیڈ مدرس تھے۔ آپ کا =

۴۰۷

فینڈر کے جواب میں بہت سے مسلمانوں نے پہل کی۔ آگرہ کے حافظ محمد جعفر نے ردّ عیسائیت میں، فینڈر کو ایک مراسلہ لکھا اور ۱۸۴۲ء میں لکھنؤ سے مطبوعہ کتاب "خلاصہ صولت ضیغم"[1]، جو رد عیسائیت میں لکھی تھی، بھیجی۔

خلاصہ صولت ضیغم، سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس وقت مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ، بالخصوص علماء عیسائیت کی تبلیغ اور مناظرہ کو اسلام کے لیے بڑا خطرہ سمجھ رہے تھے۔ بالخصوص اس لیے کہ برطانوی حکومت کے برسر اقتدار آنے کے بعد، اقتصادی اور سیاسی پستی کا شکار یہ قوم خوب سمجھ رہی تھی کہ اس کے پس پشت کمپنی بہادر کی برطانوی حکومت کیا کردار انجام دے رہی ہے۔ دنیاوی طور پر مسلمان پستی میں تھے، عیسائی مشنریوں کی تبلیغی مہمیں، مناظرہ کے لیے دعوت کے اصل مقصد کو خوب سمجھ رہے تھے کہ اس راہ سے اُن کے سب سے قیمتی سرمایہ "اسلام" پر حملہ کی تیاریاں ہیں۔ اس کا تدارک ضروری تھا۔ خدا کے فضل سے اہل علم کی بڑی بھاری تعداد مسلمانوں میں موجود تھی۔ سید عباس علی نے اس خطرہ سے مسلمانوں کو آگاہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ماضی میں جب عیسائی برسر اقتدار نہیں تھے، اُن کا عیسائی مذہب کی تبلیغ کے لیے پر جوش پروپیگنڈہ بھی منظر عام پر نہیں آیا تھا، ہمارے علماء نے عیسائیت کی طرف کوئی توجہ نہیں کی تھی لیکن دور حاضر کا یہ ایک مقدس ترین فرض ہے کہ وہ اپنی تمام تر قوت عیسائیوں کے باطل پروپیگنڈہ کے خلاف صرف کر دیں۔ یہ لوگ اپنی شاطرانہ کوششوں سے آہستہ آہستہ بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیں گے[2]

رد عیسائیت میں شیعہ علماء بھی پیچھے نہیں تھے۔ ۱۸۴۲ء میں مولانا سید محمد نصیر آبادی نے

= شمار ہندوستانی اساتذہ میں سب سے سینئر لوگوں میں تھا۔ آپ کا تعلق کاندھلہ کے ایک معزز گھرانے سے تھا۔ آپ نے اپنی تعلیم مدرسہ رحیمیہ میں شاہ محمد اسحٰق صاحب سے حاصل کی تھی۔ مولانا فضل حق خیرآبادی کا نام آپ سے اکتساب کرنے والوں میں ہے۔

[1] اب یہ کتاب عام طور سے دستیاب نہیں ہے۔ مولانا امداد صابری دہلوی نے اس کی ایک کاپی، جو اُن کے خاندانی کتب خانہ میں موجود تھی، یاول کو دکھلائی تھی۔ اس کے مصنف مولوی سید عباس علی تھے جو محمد جعفر صاحب کے بھائی تھے۔

[2] William Muir. The Mohammadan Controversy - Calcutta Review. December 1845 p-450.

فینڈر کے خطوط کے جواب میں، ردّ عیسائیت میں تحریر کردہ عربی، فارسی اور اردو کے رسائل بھیجے[1] سید محمد نصیر آبادی کی ایما پر اُن کے بھتیجے نے ردعیسائیت پر ایک رسالہ لکھا تھا۔ سید دلدار علی مجتہد العصر اور اُن کے فرزند سید محمد بھی ردعیسائیت میں سرگرم عمل رہے۔[2]

علماء کے علاوہ جدید تعلیم یافتہ حلقوں میں مسلمان وکلا بھی ردّ عیسائیت میں سرگرم رہے۔ اُن میں محمد کاظم علی، سید رحمت علی آگرہ کے دو وکیل خصوصیت کے حامل ہیں۔ سید احمد خاں[3] (سرسید) اُن دنوں آگرہ میں تعینات تھے۔ محمد کاظم علی اور سید رحمت علی کے اُن سے قریبی تعلقات تھے۔ تقریباً اسی وقت ایک اور عالم، مولانا آل حسن[4] کی شخصیت بھی ردعیسائیت میں سامنے آتی ہے۔ مولانا آل حسن کے متعلق ولیم میور، لیفٹننٹ گورنر یو پی لکھتا ہے کہ وہ بڑی صلاحیتوں کے آدمی تھے۔ مسلمانوں میں اُن کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ اُن کے علم و کمال کی بدولت اُن کو مسلم معاشرہ میں بڑا مقام حاصل تھا۔ وہ صوبجات شمال و مغرب میں صدر امینی کے عہدہ پر فائز تھے۔ آپ نے فینڈر کے جواب میں ایک مدلل اور مبسوط کتاب "کتاب استفسار" لکھی جو تقریباً آٹھ سو صفحات پر مشتمل تھی۔[5] مولانا آل حسن کی ردعیسائیت میں سرگرمی کو عیسائی انگریزی حلقوں میں پسند نہیں کیا گیا۔ اُن پر رشوت کا جھوٹا الزام لگا کر دو سال کی سزا دی گئی۔[6] آل حسن صاحب نے سزا کے خلاف اپیل دائر کی، آگرہ کے صدر جج کو مولانا کے خلاف کوئی ایسی شہادت نہیں مل سکی جس کی وجہ سے اُن کو سزا دی جاتی۔ مولانا باعزت بری کر دیے گئے۔ مولانا کئی ماہ بعد قید فرنگ سے رہائی تو پا گئے لیکن ملازمت نہیں پا سکے۔ بہرحال مولانا آل حسن کی کتاب استفسار اسلامی حلقوں میں ردعیسائیت کے لیے بہت میسر اور کارآمد ثابت ہوئی۔ فینڈر نے بھی تسلیم کیا ہے کہ کتاب استفسار

---

[1] Powel p. 171, [2] Powel p-176,

[3] حالی نے بھی ہندوستان میں عیسائی خطرہ اور اس کے مقابلہ کے لیے سرسید کی مساعی کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو حیات جاوید، لاہور ۱۹۶۶ء ص ص ۲۷ - ۴۲۳۔

[4] آپ کے والد کا نام سید غلام سعید تھا۔ موہان وطن تھا۔ کہا جاتا ہے کہ مشہور اردو شاعر اور مجاہد جنگ آزادی، حسرت موہانی کا تعلق آپ کے خاندان سے تھا۔ ملاحظہ ہو، خالد حسن قادری، حسرت موہانی، دہلی ۱۹۸۵ء

[5] Powel p.182 [6] امداد صابری، فرنگیوں کا جال، دہلی ۱۹۴۹ء ص، ۲۰۰، ۲۰۹

عیسائیوں کے خلاف ایک عظیم حربہ ثابت ہوئی تھی۔

اس دور میں رد عیسائیت میں سرگرم دو اور ممتاز شخصیتیں، مولانا رحمت اللہ کرانوی اور ڈاکٹر وزیر خاں کی تھیں۔ ان حضرات نے اپنے علمی کمال، حاضر دماغی اور زور تقریر سے ہر مناظرہ میں فینڈر اور دیگر عیسائی مبلغین کا، انجیل کے حوالوں سے مستند جواب دیا[1] ہر چند کہ مناظروں میں مسلمان علماء کا پلڑا بھاری رہا اور نہ صرف یہ کہ وہ اسلام کی حقانیت، رسول اکرم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغمبر آخر الزماں اور قرآن پاک کو الہامی کتاب ثابت کرنے میں کامیاب رہے، بلکہ انھوں نے انجیل، اور توریت کے حوالوں سے بھی یہ ثابت کر دیا کہ محمد رسول اللہ کی بعثت کے بعد گذشتہ تمام مقدس مذہبی کتابیں اور ادیان منسوخ ہو چکے ہیں[2]۔

مناظروں کا اثر یہ ہوا کہ مشنریوں اور برطانوی حکومت کے عہدیداروں پر یہ بات واضح ہوگئی کہ مناظروں کی راہ سے مسلمانوں کو تبدیلی مذہب پر مائل کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اُن کی توقع کے خلاف ان مذہبی مناظروں نے یہ آگہی پیدا کر دی کہ حکومت وقت کی سرپرستی میں کس طرح سے مشنریز اسلام کے خلاف کام کر رہی ہیں۔ وہ علماء کی قیادت میں اپنے دین پر قائم رہے، لیکن غالبًا انھیں یہ اندیشہ بھی تھا کہ حکومت وقت خود عیسائیوں کی ہے اور پادریوں کا مستقل اسلام دشمن پروپیگنڈہ رنگ لائے گا۔ اسی اندیشہ کے تحت علماء کرام کی اکثریت بغیر تفریق مسلک، جا بجا انگریزوں کے خلاف سرگرم عمل تھی یہی خیالات کم و بیش ہندوؤں کے بھی تھے کیونکہ مشنریز ہندوستان کے تمام مذہبی پیشواؤں کا مذاق اڑا رہے تھے[3]۔

غرض یہ کہ ہندوستان میں کمپنی کی برطانوی حکومت کے قیام نے، ہندوستانیوں کے اقتصادی استحصال کے ساتھ اُن کے مذاہب پر نکتہ چینی اور حملوں کا ایک طویل سلسلہ شروع کر دیا۔ اس کی وجہ سے عام ناراضگی پائی جاتی تھی۔ بالخصوص مسلمانوں میں

---

[1] فرنگیوں کا جال، ص ص ۱۶۸ – ۱۱۵۔

[2] فرنگیوں کا جال ص ص ۱۶۸ – ۱۱۵۔

[3] فرنگیوں کا جال ص ص ۱۱۹۔

اس کا اثر زیادہ تھا، مذہب سے لگاؤ اور اس کے تحفظ کا ان میں شدید احساس ابھر آیا۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کی طرح ہندوؤں کو بھی شکایت تھی ۱۸۵۵ء تک ہندوؤں اور مسلمانوں کے صبر وتحمل کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ تبلیغ اور مناظرہ کے نام پر عیسائی مشنریز کا ہندوستانی مذاہب کے تمسخر نے جلتے پر تیل کا کام دیا اور ۱۸۵۷ء کی جنگ عظیم آزادی کی راہ ہموار کر دی۔ بیرک پور میں منگل پانڈے کی بغاوت اور مئی ۱۸۵۷ء میں میرٹھ کی بغاوت کے پس پشت انگریزوں کے خلاف اُن کی سیاسی بازی گریوں، اقتصادی استحصال اور مذاہب پر گندے اور رکیک حملوں کی نفسیات کارفرما تھی۔

آج ۱۹۹۴ء میں ہندوستان فرقہ وارانہ منافرت سے دوچار ہے لیکن ڈیڑھ سو سال پہلے کے ہندوستان میں یہ بات مفقود تھی۔ ہندو اور مسلمان اپنے اپنے مذاہب پر سختی سے قائم تھے، مذہبی فرائض ادا کرتے تھے۔ لیکن ایک دوسرے کے مذاہب کے تقدس کو تسلیم کرتے اور احترام کرتے تھے۔ اس کی بے شمار مثالیں ۱۸۵۷ء کے درمیان ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران، مجاہدین آزادی نے بہت سے اعلانئے شائع کئے تھے ان میں ایک اعلانیہ کا نام "فتح اسلام" تھا اس اعلانیہ میں برطانوی حکومت کی صدسالہ تصویر پیش کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ وہ کس طرح سے ہندوستان کے دو بڑے مذہب اسلام' اور 'ہندو مذہب کو برباد اور مسخ کر رہی ہے۔ اعلانیہ میں یہ اپیل تھی کہ عوام اپنا امیر منتخب کرلیں تاکہ انگریزوں کے خلاف فیصلہ کن جنگ لڑی جا سکے۔ ہندوؤں سے بھی اپیل تھی وہ اپنے مذہب کے تحفظ کے لیے اس امیر کے ساتھ شریک ہو جائیں، تاکہ ہندو اور مسلمان دونوں ہی بھائیوں کی طرح مل جل کر ایک دوسرے کے مذہب کا تحفظ کر سکیں[۱]۔ اسی طرح شاہزادہ فیروز شاہ کا اعلانیہ بھی قابل توجہ ہے: "یہ سب لوگوں کے علم میں ہے کہ اس دور میں ہندوستان کے عوام، ہندو اور مسلمان، دونوں کافر اور دھوکا باز انگریزوں کے ظلم وستم کا شکار ہو کر تباہ ہو رہے ہیں[۲]"

۱؎ S.A.A. Rizvi, Freedom Struggle in U.P. Vol. I p. 456-58

۲؎ کنہیا لال، تاریخ بغاوت ہند، ۱۸۵۷ء، نول کشور ۱۹۱۶ء، ص ۳۸۵

ان اعلانیوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے رویہ اور مشنریز کی عیسائیت کی تبلیغ سے ہندوستانی عوام، بلا تفریق مذہب، اپنے اپنے مذہب کے تحفظ کے لیے شعوری طور پر بیدار تھے۔ بہادر شاہ ظفر، مولوی لیاقت علی الٰہ آبادی، بیگم حضرت محل، رانی جھانسی وغیرہ کے اعلانئے اس کا مزید ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ابتدا اور اس کے جبری استیصال تک، الٰہ آباد، لکھنؤ، بریلی، کانپور، دہلی، گوالیار، جھانسی وغیرہ، جو بغاوت کے مرکز تھے، ہر جگہ علماء اور فارغین مدرسہ پیش پیش تھے۔ یہی وجہ تھی کہ برطانوی حکومت نے ۱۸۵۷ء میں برسر اقتدار آنے تک، علماء اور مسلمانوں کو خصوصًا اپنے جور و ستم کا نشانہ بنایا۔ ہزاروں کی تعداد میں مسلمان، بغیر مقدمہ چلائے نذرِ دار کر دیے گئے یا گولی کا نشانہ بنا دیے گئے[1] جو لوگ روپوش ہو گئے تھے اُن کی تلاش جاری رہی اور جیسے جیسے یہ لوگ گرفتار ہوتے گئے، یہ بھی دار پر لٹکا دیے گئے یا عمر قید کی سزا دے کر جزیرہ انڈمان میں قید کر دیے گئے[2] پورے شمالی ہندوستان میں برسوں تک انگریزی بربریت اور ظلم و ستم کا ننگا ناچ ہوتا رہا۔ اس کا شکار مسلمان ہی تھے۔ جواہر لال نہرو اپنی خودنوشت سوانح میں لکھتے ہیں:-

"۱۸۵۷ء کے بعد برطانوی حکمرانوں کا ظلم و ستم، ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلمانوں پر زیادہ رہا" اس کی تائید برطانوی اور ہندوستانی مورخین بھی کرتے رہے ہیں[3] مسلمانوں پر مظالم کی انتہا دیکھ کر جارج کیمبل کو یہ اندیشہ محسوس ہونے لگا تھا کہ مسلمان بحیثیت جماعت بالکل نابود نہ ہو جائیں[4] مسلمان انگریزوں کی نگاہ میں بے حد خطرناک اور خوفناک قوم تھی۔ رسل لکھتا ہے:-

---

[1] مولوی ذکاء اللہ کے بیان کے مطابق ۲۷ ہزار مسلمان صرف دہلی میں شہید کیے گئے۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ۔

[2] مولانا فضل حق خیرآبادی، مولوی جعفر تھانیسری وغیرہ۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو، اے آر ملک ص ۱۹۷-۲۰۱

[3] ملاحظہ ہو، A. Lyall, Asiatic Studies, London 1884, ص ص ۳۰-۲۲۹، تاراچند، ہسٹری آف فریڈم موومنٹ ان انڈیا، جلد دوم، دہلی ۱۹۶۷ء، ص ۳۶۷۔

[4] Campbell, Memoires Vol-II p-397.

The fact is that the Mohammadan element in India is that which causes us most trouble and provokes, the largest share of our hos--tility, Our missionories make no progress in the Musalman Districts.Our religious and educational movements are watched by the Ma-ulvies and fanatics with greatest suspicion. Our antagonism to the followers of Mohammad is far stronger than that between us and wo--rshippers of Shiva and Vishnu. They are un--questionably more dangerous to our rule.[1]

"یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا طبقہ ہمارے لیے زیادہ مشکلات پیدا کر رہا ہے اور ہماری دشمنی کو فروغ دینے میں زیادہ سرگرم کار ہے۔ مسلمان اضلاع میں ہماری مشنری تحریکیں کچھ بھی پیش رفت نہیں کر سکی ہیں۔ مولوی لوگ اور متعصب مسلمان ہماری مذہبی اور تعلیمی تحریکوں کو سخت شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ شیو اور وشنو کے پرستاروں کے مقابلے میں محمدؐ کے اطاعت گزار ہمارے بڑے مخالف ہیں۔ یہ لوگ درحقیقت ہماری حکومت کے لیے زیادہ خطرناک ہیں۔"

مرزا اسداللہ خاں غالب، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران دہلی ہی میں مقیم رہے۔ انگریزوں نے دوبارہ دہلی پر قبضہ کیا تو باوجود تمام حزم و احتیاط کے ان کے قلم سے نکل ہی گیا کہ یہاں میرے سامنے خون کا وسیع دریا ہے، صرف خدا ہی جانتا ہے کہ مجھے اور کیا دیکھنا باقی ہے۔ انگریزوں نے بہادر شاہ ظفر کے بیٹوں کے ساتھ جو سلوک کیا وہ مہذب

---

[1] Russel, My Diary in India in the years 1858-59. London 1859 p-283

دنیا کے لیے شرمناک ہے۔ تیس[3] شاہزادوں پر مقدمہ چلاکر دار پر چڑھا دیا گیا یا سر قلم کر کے بادشاہ کے پاس تحفتاً بھیجا گیا۔[1] اسی ذیل میں ظہیر دہلوی لکھتے ہیں کہ انگریزی سپاہیوں نے ان تمام لوگوں کو گولیوں کا نشانہ بنا دیا جو اُن کو راہ میں ملتے گئے، میاں محمد امیر پنجہ کش اور بہت سے شریف خاندانی لوگ، انگریزوں کی بربریت کا شکار ہوئے۔ محمد امیر پنجہ کش کے علاوہ مولوی امام بخش صہبائی اور اُن کے دو بیٹے، نیاز علی واقعہ خواں اور چیلوں کے کوچہ کے بہت سے لوگ، دار پر چڑھا دیے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ صرف کوچہ چیلان کے چودہ سو افراد کو راج گھاٹ کے دروازہ سے دریا پار لے جا کر گولیوں سے ختم کر دیا گیا اور ان کی لاشوں کو دریا میں پھنکوا دیا گیا۔[2]

دہلی سے مسلمانوں کا تقریباً مکمل اخراج ہو چکا تھا۔ جب عام معافی کا اعلان ہوا تو پہلے دہلی کی ہندو آبادی کو، اُن کی املاک کی مالیت کا دس فیصد جرمانہ ادا کر کے داخلہ کی اجازت ملی۔ چند ماہ بعد مسلمانوں کو اُن کی املاک کی مالیت کا پچیس فیصد جرمانہ ادا کر کے داخلہ کی اجازت دی گئی۔ یہ تو ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ سلوک کیا جا رہا تھا، لیکن ذرا یہ غور فرمائیں کہ انیسویں صدی کی مہذب ترین اور طاقتور انگریز قوم کا رویہ مسلمانوں کے لیے خود اُن کے ملک میں کیا تھا۔ اکتوبر ۱۸۵۷ء میں برطانوی وزیر اعظم لارڈ پامرسٹن نے ہندوستانی گورنر جنرل لارڈ کیننگ کو یہ ہدایت بھیجی کہ وہ تمام شہری عمارات جو مسلمانوں کے رسم و رواج سے تعلق رکھتی ہوں، مسمار کر دی جائیں، بغیر کسی خیال کے کہ اُس کے ساتھ اُن کے کیا قدیمی احترامی جذبات اور عمارتوں کے فنی پہلو ہیں۔[3] یہ حکم واضح طور پر جامع مسجد کی مسماری کا تھا جس پر انگریزوں نے قبضہ کر کے فوج کی چھاؤنی بنا دی تھی۔

انگریزوں نے اپنے اقتدار کی بحالی اور اپنی حکومت کی مضبوطی کو قائم رکھنے کے لیے مسلمانوں کو نشانۂ ہدف بنایا۔ ہندوستان میں امتِ مسلمہ پر بڑا سخت وقت تھا۔

---

[1] ظہیر دہلوی، داستانِ غدر، لاہور ۱۹۵۵ء ص ۱۶۴ [2] ایضاً ص ۱۷ - ۱۶۹

[3] خط نمبر ۹، مورخہ ۹ / اکتوبر ۱۸۵۷ء بحوالہ Letter from Her Majesty. Minister's February 1856- to February 1862. Canming Papers London.

ضرورت اس بات کی تھی کہ قوم کو کسی طور سے مزید نقصانات سے بچایا جائے۔ اُن تحت حالات میں سید احمد خاں نے دور اندیشی سے کام لیا۔ اسباب بغاوت ہند لکھی۔ وقت کے تقاضہ کے تحت مسلمانوں اور برطانوی حکمرانوں کے درمیان پیدا شدہ خلیج کو دور کرنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں وہ کبھی کبھی اُن حدود سے تجاوز کر گئے جو علماء دین کی نظر میں قابلِ گرفت اور ناپسندیدہ تھی، لیکن سید احمد خاں نے جو بھی کیا وہ بر بنائے خلوص تھا۔ ہر چند کہ برطانوی حکومت سید احمد خاں کی آواز پر توجہ دیتی تھی لیکن مسلمانوں کے متعلق اُن کی پالیسی "غیر اعتماد اور عداوت" ہی کی تھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں علماء کرام اور عام مسلمانوں کے جوش و خروش، اتحاد اور قربانیوں نے اُن کے دلوں میں یہ بات بٹھادی تھی کہ مسلمانوں کا اتحاد، انگریزی حکومت کے استحکام کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔ سید احمد شہید کے رفقاء اور ہم نوا نہ صرف ۱۸۵۷ء میں سرگرم عمل رہے تھے بلکہ ۱۸۵۸ء کے بعد بھی، سرحدی علاقوں میں اُن کی سرگرمی اپنی تمام تر بے سروسامانیوں کے باوجود جاری تھی[1] انگریز حکمرانوں نے مسلمانوں کی وحدت کو پاش پاش کرنے کے لیے حکمت عملی سے کام لے کر دو بڑے اقدام کیے۔ سرحدی علاقوں میں مسلمانوں کے خلاف زبردست فوجی کارروائی اور ایک مستقل خفیہ پولس کے محکمے کا قیام، جس کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ سرحدی علاقوں میں پہنچنے والی امداد کے اصل ماخذ کا پتہ لگائیں۔ دوم، حکومت کی طرف سے مناظروں کی ہمت افزائی۔ ان مناظروں کا موضوع یہ رکھا گیا کہ کیا برطانوی حکومت کے خلاف جہاد جائز ہے؟ سرحدی علاقہ میں انگریزوں کی فوجی حکمت عملی بری طرح ناکام رہی[2]، ہاں خفیہ پولس کے محکمہ کے قیام اور اس کی کارکردگی کا نتیجہ یہ نکلا کہ بنگال، بہار، یوپی اور پنجاب میں مجاہدین کے مراکز پر یلغار کر کے ان کے خلاف مقدمات قائم کر کے حبس دوام اور طویل مدت کی سزائیں سنائی گئیں[3]۔ مناظرے یک طرفہ ہوئے۔ حکومت کی فوجی اور پولس کارروائیوں کے ساتھ عدالتی کارروائیوں نے، مسلمانوں کی قوت مدافعت بھی وقتی طور سے ختم کر دی تھی۔ اس کا بڑا سبب ۱۸۵۷ء کی برطانوی

---

[1] تاراچند، فریڈم اسٹرگل، جلد دوم ص ص ۲۹ - ۲۷

[2] تاراچند، جلد دوم۔ ص ص ۳۰ - ۲۹۔ [3] ایضاً

٣١٥

بے رحمانہ اور سفاکانہ کارروائیاں تھیں۔ مذہبی طور سے مسلمانوں میں مزید انتشار پیدا کرنے کے لیے مکہ معظمہ سے مفتی مکہ کا فتویٰ بھی انگریزوں نے حاصل کر کے، ہندوستان بھر میں عام کر دیا کہ برطانوی حکومت کے خلاف جہاد کرنا جائز نہیں ہے[1] انھوں نے بعض ہندوستانی علما کو بھی اسی طرح کے فتوے دینے پر آمادہ کر لیا[2] بات یہیں نہیں ختم ہوئی، آثار و قرائن کے علاوہ بعض ایسے شواہد بھی ملتے ہیں جن سے اس تصور کو تقویت ملتی ہے کہ انگریزی حکومت نے ہندوستان میں مسلمانوں کی اجتماعی قوت ختم کرنے کے لیے مسلکی اختلافات کو بھی ہوا دی۔ اگر ہم ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد، مسلمانوں کے اندر مسلکی اعتبار سے ابھرنے والے مختلف گروہوں پر نظر ڈالیں اور حکومت کی طرف سے اُن کی پذیرائی پر غور کریں تو بڑی حد تک بات از خود صاف ہو جاتی ہے۔ پنجاب میں احمدیہ فرقہ کا عروج، یوپی میں بریلوی فرقہ پر حکومت کی توجہ کے پس پشت مسلمانوں کی سرپرستی مقصود نہیں تھی بلکہ سیاسی مصلحت زیادہ کارفرما تھی تاکہ سنی مسلمانوں کو فرقوں کے خانہ میں تقسیم کر کے مسلمانوں کے سب سے بڑے گروہ کو انتشار اور نفاق میں مبتلا کر دیا جائے۔ شیعہ سنی مسلکی اختلافات کو انگریزی حکومت کی سرپرستی میں اور ابھارا گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مسلمانوں میں مسلکی اختلافات موجود تھے۔ اس میں بھی کوئی کلام نہیں ہے کہ ان ہی اختلافات کی وجہ سے اُن کے اندر مختلف گروہ پائے جاتے تھے اور آج بھی پائے جاتے ہیں۔ لیکن ۱۸۵۷ء سے پہلے مسلکی اختلافات کی نوعیت علمی مباحث اور افراد تک محدود تھی۔ اللہ کی وحدانیت اور جناب رسول کریم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی حقانیت پر ایمان، مختلف گروہوں کو ایک لڑی میں پروئے ہوئے تھا۔ مسلکی اختلافات کی نوعیت فروعی تھی، اس میں شدت اور کٹرپن نہیں تھا، لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے فرو ہونے کے بعد، ابھرتی ہوئی گروہی عصبیت نے مسلمانوں کے اتحاد کو کمزور کرنا شروع کر دیا۔ اُن کی ساری قوت مسلمانوں میں اتحاد کے قیام کے بجائے مسلکی مباحث، اور اختلافی مسائل کی نذر ہونے لگیں۔ انگریزوں کی مراد برآئی۔ اُن کی سیاسی حکمت عملی کامیاب ہو گئی اور مسلمان آہستہ آہستہ انتشار کے سیل گراں میں بہہ گئے۔

---

[1] تاراچند، جلد دوم، ص ص ۳۰۔ ۲۶، رام گوپال۔ انڈین مسلمز، بمبئی ۱۹۵۹ء ص ص ۲۵۔ ۲۴۔

[2] مولوی کرامت علی جون پوری، مولوی عبداللطیف وغیرہ.....

مسلمانانِ بنی اسرائیل دہلی سلطنت کے عہد میں

پروفیسر اقتدار حسین صدیقی

قدیم اسلامی عربی لٹریچر میں اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف حجاز کے یہودیوں کے مخالفانہ رویہ کا ذکر بڑی تفصیل سے ملتا ہے۔ لیکن اُن سے جنگوں میں مسلمانوں کی فتح اور اُن سے صُلح کا معاہدہ ہونے کے بعد یہودیوں کو اسلامی مملکت میں مکمل مذہبی اور سماجی آزادی مِل گئی تھی۔ وہ ذِمّی کی حیثیت سے محفوظ ہو گئے تھے۔ چونکہ اسلام کے ابتدائی دور ہی میں نہیں، ان کے بعد بھی مسلمان مذہبی تنگ نظری اور تعصبات سے آزاد تھے اور کھلا ذہن رکھتے تھے۔ ان کے اندر خدمت خلق کا بے پناہ جذبہ تھا اور وہ انسانی ہمدردی سے سرشار تھے۔ چنانچہ اسلامی مملکت میں غیر مسلم لوگوں کے ساتھ ان کا رویہ مثالی رہا ہے۔ مسلم حکمران طبقہ بھی سماجی انصاف کے سلسلے میں مسلم اور غیر مسلم کے مابین تفریق نہیں کرتا تھا۔ مثال کے طور پر ذمیوں یعنی غیر مسلم شہریوں کے ساتھ حکمران طبقہ کو اچھے سلوک کی تلقین کرتے ہوئے امام ابویوسف اپنی تالیف "کتاب الخراج" میں حضرت عمر فاروقؓ کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ ایسے ذمیوں کی جو روزی کمانے سے معذور تھے اُن کی بیت المال سے مدد کرتے تھے۔ ایک دن انھوں نے ایک بوڑھے بھکاری کو کسی کے دروازے پر بھیک مانگتے دیکھا تو اس کے نزدیک جا کر اس کے بازو پر ہاتھ رکھا اور پوچھا: تمہارا مذہب کیا ہے؟ بھکاری نے کہا میں یہودی ہوں۔ عمر فاروقؓ: تم بھیک کیوں مانگتے ہو؟ بھکاری نے جواب دیا: میں بھیک سے جزیہ ادا کرتا ہوں اور اپنی معاش فراہم کرتا ہوں۔ عمر فاروقؓ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے گئے اور اُسے کچھ اندر سے لا کر دیا۔ پھر بیت المال کے افسر اعلیٰ کو بُلا کر کہا: اس کا اور اس جیسے معذور لوگوں کا خیال رکھو۔ بخدا یہ انصاف نہیں ہے کہ ہم اس کی جوانی کھائیں اور بڑھاپے میں اس کو بے سہارا چھوڑ

دیں۔ عمر فاروقؓ نے اُس کا اور اس جیسے معذور ذمیوں کا جزیہ معاف کر دیا۔[1]

ایشیا اور افریقہ کے مختلف ممالک میں اسلام کے فروغ اور وہاں مسلم حکومت قائم ہونے پر مسلمانوں کے ساتھ یہودی تجار بھی آباد ہو گئے۔ ہر ملک میں یہودیوں نے اپنے تجارتی مراکز قائم کیے جو کہ اُن کی بین الاقوامی تجارتی انجمن (diaspora) کا حصہ تھے۔ بحری اور برّی تجارت میں شمولیت اور سُود پر روپیہ دینے کے کاروبار کی وجہ سے اُن کے سرمایہ میں بڑا اضافہ ہوا۔ ابتدائی ہندوستانی فارسی لٹریچر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تجارت کے سلسلے میں یہودی تجار سلطنت غزنی، غور کے پہاڑی علاقہ اور خراسان میں کثیر تعداد میں آباد ہو گئے تھے۔ چونکہ وسط ایشیا کے ملکوں کی خوشحالی اور وہاں صنعت و حرفت کی ترقی بیرونی تجارت کے فروغ سے وابستہ تھی لہٰذا حکمراں طبقہ تجار کی ہمت افزائی اور قدر دانی کرتا تھا۔ خواجہ فریدالدین عطار کے مطابق اُن کے اپنے وطن خراسان میں اتنے یہودی رہتے تھے کہ اُن کے ادا کیے ہوئے جزیہ سے وہاں کا حکمراں اپنے جملہ ذاتی مصارف پورے کر سکتا تھا۔ حکمراں مذہبی تھا اور اس کی نگاہ میں دوسرے ٹیکسوں سے حاصل کیے ہوئے روپیہ کی بہ نسبت جزیہ کا روپیہ شریعت اسلامی کے مطابق پاک اور صاف تھا۔ خواجہ عطّار فرماتے ہیں: "ایک دن ایک دوست نے اُن سے کہا کہ فلاں شخص (یعنی حکمراں) بطریق حلال روزی کماتا ہے یعنی یہودیوں سے جزیہ وصول کر کے اپنا پیٹ پالتا ہے۔ اُس سے اچھی کمائی اور کیا ہو سکتی ہے۔ شیخ نے فرمایا "میں اُس کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں تنگِ جہاں ہوں اگر سوؑ یہودی بھی مجھ سے جزیہ لیں تو کم ہے۔"[2]

---

[1] کتاب الخراج۔ بحوالہ خورشید احمد فارقؔ، جائزے، حصہ اول، دہلی ۱۹۸۱ء ص ۳۷۲۔ کتاب الخراج خلیفہ ہارون الرشید (م ۱۹۳ھ) کے عہد میں اس کی رہبری کے لیے لکھی گئی تھی۔ اس کا شمار عربی کی قدیم ترین تصنیفات میں ہوتا ہے۔

[2] عطّار کے اشعار ہیں: رفیقی گفت با من کان فلانی — حلالی می خورد قوتِ جہانی

کہ جزیہ از جہودان می ستاند — وز آن جا، می خورد بہ زین کہ داند

بدو گفتم کہ من آن می ندانم — من آن دانم کہ از تنگ جہانم

کہ باید صد جہودِ بس پریشان — کہ تا خواہند از من جزیہ ایشاں =

۱۸م

تجارت کے علاوہ یہودی مختلف علوم، صنعت وحرفت اور فنون لطیفہ میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ ان میں سے بعض اہلِ علم اور ماہرین فن مسلم حکمراں اور رؤساء کے درباروں سے بھی منسلک ہوجاتے تھے۔ مثال کے طور پر سلطان محمود غزنوی اور اس کے جانشین بغیر مذہبی تعصب یا تفریق کے اہلِ دانش اور اصحاب فن کی قدر دانی کرتے تھے۔ اس سے یہودی، عیسائی اور ہندو برابر مستفیض ہوئے[1]

سلطنتِ دہلی کی تاریخ وسط ایشیا، کے مذکورہ بالا علاقوں سے منسلک تھی اس لیے غور، غزنی اور خراسان کے مسلمانوں کی طرح معلوم ہوتا ہے یہودی تجار نے بھی ہجرت کرکے دہلی سلطنت کا رخ کیا۔ یہود زمانۂ قدیم سے ایک خاص تہذیب کے علم بردار تھے اس لیے خیال ہوتا ہے کہ ہندوستانی مسلم ثقافت کے ارتقا میں ان کا اہم رول رہا ہوگا۔ منہاج سراج جوزجانی نے اپنی تاریخ "طبقات ناصری" میں یہودیوں کا ذکر "دین مہتر موسیٰؑ" کے پیرو کے نام سے کیا ہے[2] اکثر مسلم ممالک میں کچھ یہودی اسلام سے متاثر ہوکر مسلمان بھی ہوجاتے تھے۔ یہ اور ان کے ورثا، عام یہودیوں اور اپنے مابین فرق کرنے کی غرض سے اپنے نام کے بعد بنی اسرائیل یا اسرائیل لگا لیتے تھے[3] اس دور کی تاریخ کی کتابوں میں تو یہودیوں کا ذکر بہت

= ملاحظہ کیجیے: مقالات حافظ محمود شیرانی ج۔ پنجم لاہور ۱۹۷۰ء ص ۴۵۲۔ ۴۵۳

[1] فخر مدبر نے ایک عراقی عیسائی طبیب ابوسعید موصلی کا ذکر کیا ہے کہ وہ سلطان بہرام شاہ کے عہد میں غزنی آیا اور جلد ہی اپنی طبی مہارت کی بنا پر مشہور ہوگیا۔ سلطان کے حرم میں ایک ہندوستانی کنیز تھی جو کہ اپنے حسن وجمال کی وجہ سے سلطان کی منظورِ نظر ہوگئی تھی۔ اتفاقاً وہ سخت بیمار ہوگئی۔ شاہی اطباء اس کے علاج میں ناکام رہے۔ بالآخر ابوسعید موصلی کو اس کے علاج کے لیے طلب کیا گیا۔ طبیب نے کہا کہ وہ مریض کی نبض جانچنے کے علاوہ اس کے چہرہ کو بھی دیکھنا چاہے گا۔ سلطان نے مجبوراً اجازت دے دی۔ جب طبیب نے کنیز کو دیکھا تو وہ اس پر فریفتہ ہوگیا اور گھر واپس ہونے پر ہوش وحواس کھو بیٹھا۔ معلوم کرنے پر اس نے سلطان کے مصاحبین سے کہا کہ اگر اس کی شادی کنیز سے کردی جائے تو وہ مسلمان ہوکر زندہ رہنا چاہے گا۔ جب سلطان کو طبیب کے متعلق معلوم ہوا تو اس کو سخت غصہ آیا لیکن پھر کچھ سوچ کر اس نے ابوسعید موصلی کی شرط مان لی اور اس کو مسلمان بنا کر اُس سے کنیز کی شادی کردی۔ اس کنیز سے طبیب کے کئی بچے ہوئے۔ جو کہ فخر مدبر کے مطابق بڑے اچھے مسلمان تھے۔ ان کا باپ شاہی اطبا میں اچھا مقام رکھتا تھا۔ محمد بن منصور بن سعید ملقب بمبارک شاہ معروف بفخر مدبر۔ آداب الحرب والشجاعۃ، بتصحیح احمد سہیلی خوانساری۔ ایران ۱۳۴۶ھ شمسی، ص ص ۴۲ تا ۴۵۔

[2] طبقات ناصری، جلد اول، بتصحیح عبدالحی حبیبی، کابل ۱۹۶۳ء ص ۳۲۵۔ [3] تاریخ مدبر، ص ۷۰۔

کم پایا جاتا ہے لیکن ہمارے صوفی لٹریچر میں یہودیوں کی اسلامی تصوّف سے دلچسپی اور صوفیاء کی طرف ان کے میلان کا کافی تفصیل سے ثبوت ملتا ہے۔ حالانکہ اس تفصیل میں اکثر مافوق الفطرت عناصر کی شمولیت کے ساتھ ساتھ افسانوی حکایات بھی ہیں تاہم اس میں تاریخی واقعات کی بھی کمی نہیں ہے۔[۱]

یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ یورپ کے عیسائی[۲] اور مسلم علماء بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ یہودی مذہبی نقطۂ نظر سے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے منتخب بندے تصور کرتے ہیں اور دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو اللہ تعالیٰ کا دشمن اور قابل گردن زدنی سمجھتے ہیں۔ ابوریحان البیرونی مذاہب کے تقابلی مطالعہ کا شوق رکھتے تھے جیسا کہ اُن کی شہرہ آفاق تالیف 'کتاب الہند' سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ ہند و مذہب اور کلچر پر پہلی غیر جانبدارانہ علمی تحقیق کا نتیجہ ہے۔ البیرونی اپنی ایک دوسری تالیف "نہایت الاماکن" جو کہ علم جغرافیہ سے متعلق ہے، میں قدیم جغرافیہ دانوں کو درپیش دشواریوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ زمانہ قدیم میں نسلی اور سماجی تقسیم اور انسانی گروہوں کے درمیان مذہبی تعصبات کی بناپر دشمنی تھی۔ راستے غیر محفوظ تھے موت اور ہلاکت کے خطرے کی وجہ سے لوگ دور دراز کے علاقوں کے سفر سے بچتے تھے لہٰذا معلومات کے ذرائع محدود تھے اور

---

[۱] صوفیاء کرام کے تذکروں سے ان افسانوی حکایات کو الگ کرنا علم و تحقیق کی ایک بڑی خدمت ہے۔ لیکن افسوس کہ یہ حکایات صوفیاء کرام کی زندگی کا ایک لازمی جز بن گئی ہیں۔ ان کے بغیر ان کا ذکر خیر مکمل ہی نہیں ہوتا۔ بعد کے اصحاب علم ہمارے غیر محتاط تاریخ نگاروں یا حکایات نویسوں کے بیانات کو بغیر کسی نقد و تبصرہ کے نقل کرتے چلے جاتے ہیں اس طرح ان کی خاموش تصدیق ہوتی رہتی ہے۔ کوئی اللہ کا بندہ نقد و جرح کی کسوٹی پر انھیں پرکھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اس طرح کے واقعات یا حکایات خود اس مضمون میں موجود ہیں لیکن فاضل مقالہ نگار نے جن کی نظر ہندوستان کی مسلم تاریخ پر بڑی گہری ہے، ان کی صحت و عدم صحت سے کوئی تعرض نہیں کیا ہے۔

(جلال الدین)

[۲] اس ضمن میں شکسپیر کا ڈرامہ (Merchant of venice) کی مثال دی جا سکتی ہے جس میں یہودیوں اور عیسائیوں کے درمیان تعلقات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ شکسپیر کے مطابق یہودی عیسائیوں کی ایذا رسانی کے لیے تیار رہتے تھے۔

شہروں اور ملکوں کے متعلق اُن کی معلومات ناقص ہوتی تھیں۔ اس سلسلے میں البیرونی یہودیوں کا خاص طور پر ذکر کرتے ہیں کہ یہودیوں کے نزدیک مذہبی ثواب حاصل کرنے کا ذریعہ غیر یہودیوں کو فریب کے ذریعہ قتل کرنا یا اُن کو ایذا پہنچانا تھا[1] لیکن اس علم کے باوجود سلطنت غزنی اور دوسرے مسلم ممالک میں یہودیوں کے ساتھ عمدہ سلوک ہوتا تھا اور یہودی تجار کی قدر دانی ہوتی تھی جیسا کہ صوفی لٹریچر سے معلوم ہوتا ہے۔

شیخ علی ہجویری کی تالیف "کشف المحجوب" اور سدید الدین محمد عوفی کی معرکۃ الآرا کتاب "جوامع الحکایات ولوامع الروایات" میں ابوعلی فضیل بن عیاض کے احوال میں آتا ہے کہ وہ ابتدائی زمانہ میں رہزن تھے۔ وہ جس شخص کو لوٹتے تھے اس کا نام اپنی ڈائری میں مع اس کے سامان کے درج کر لیتے تھے۔ جب اُن کو توفیق الٰہی ہوئی تو انھوں نے رہزنی کا پیشہ ترک کر دیا اور صحیح معنوں میں تائب ہو گئے۔ اپنے گناہوں کی تلافی کے لیے اپنی ڈائری کے مطابق لوگوں سے مل کر اُن کا مال یا اس کی قیمت دینے لگے۔ جب اُن کے پاس مال اور روپیہ ختم ہو گیا تو وہ لوگوں سے ملتے اور معافی کے خواستگار ہوتے۔ لوگ ان کی حالتِ زار اور بدلے ہوئے رویہ سے متاثر ہو کر اُن کو معاف کر دیتے تھے۔ لیکن اُن کے لوٹے ہوئے لوگوں میں ایک یہودی بھی تھا۔ جب وہ یہودی کے پاس گئے اور معافی مانگی تو اُس نے کہا کہ یا تو وہ اس کا مال واپس کریں یا اُس کے عوض میں اُس کی ملازمت کریں۔ مجبوراً فضیل بن عیاض کو اس کی شرط ماننی پڑی۔ یہودی نے اپنے گھر کے سامنے ریت کا ایک ٹیلہ اُن کو دکھایا اور کہا کہ وہ اس کو صاف کر دیں۔ یہ کام ایسا تھا کہ وہ اس کو ایک طویل مدت میں بھی صاف نہیں کر سکتے تھے۔ تاہم وہ اس کو صاف کرنے میں مصروف ہو گئے۔ کئی دن کے بعد ایک شب زبردست ہوا کا طوفان آیا جب صبح ہوئی تو دیکھا گیا کہ ٹیلہ صاف ہو چکا ہے۔ یہودی کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ وہ گھر کے اندر واپس گیا اور کمرے میں بستر کے نیچے کچھ رکھ کر باہر آیا اور فضیل بن عیاض کو گھر کے اندر لے جا کر اُن سے کہا کہ فلاں کمرے میں تکیہ کے نیچے

---

[1] ملاحظہ کیجئے راقم الحروف کی انگریزی تصنیف
Perso-Arabic Sources on the Life and Conditions in the Sultanat of Delhi, New-Delhi 1992, P. XII

سونے کے سکّے رکھے ہیں وہ اُن کو اُٹھا لائیں۔ چونکہ فضیل صدق دل سے تائب ہو گئے تھے اور اُن پر فضل ربی تھا لہٰذا تکیہ کے نیچے رکھی ہوئی خاک سونے کے سکّوں میں تبدیل ہو گئی تھی۔ لہٰذا فضیل ان سکّوں کو اُٹھا کر یہودی کے پاس لے آئے۔ یہودی نے سکّے دیکھ کر اُن سے کہا کہ اُس کو اسلام کے سچا دین ہونے میں جو شبہ تھا وہ ختم ہو گیا۔ کیونکہ اُس نے اپنی مذہبی کتابوں سے اخذ کیا تھا کہ سچے دین کے ماننے والے صالحین کو اللہ یہ صلاحیت عطا فرماتا ہے کہ اگر وہ چاہیں تو اُن کے چھونے سے خاک سونے میں بدل جاتی ہے۔ میں نے آزمائش کے لیے تکیہ کے نیچے خاک رکھدی تھی اور چونکہ اللہ تعالیٰ آپ کو مصیبت سے نجات دینا چاہتے تھے اور مجھے اسلام قبول کرنے کی سعادت سے سرفراز کرنا تھا لہٰذا خاک سونا بن گئی۔ اب میں مسلمان ہوتا ہوں اور آپ کو معاف کرتا ہوں۔[1]

ایک دن شیخ نظام الدین اولیاءؒ کی مجلس میں اُن کا ایک نومسلم مرید اپنے بھائی کے ساتھ حاضر ہوا اور شیخ سے کہا کہ وہ اُس کا بھائی ہے۔ شیخ نے پوچھا: کیا تمہارا بھائی اسلام کی طرف مائل ہے۔ نومسلم: اس کو اسی مقصد سے لایا ہوں کہ حضرت کی نظر کی برکت سے وہ مسلمان ہو جائے۔ شیخ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ انھوں نے فرمایا کہ ایسے لوگوں سے کتنا ہی کہا جائے اُن پر اثر نہیں ہوتا ہے۔ لیکن ہاں اگر وہ کسی صالح آدمی کی صحبت میں آئیں تو اس کے اثر سے اسلام کی طرف مائل ہو سکتے ہیں۔ پھر مزید وضاحت کے لیے آپ نے شیخ ابو یزید بسطامیؒ (م ۸۷۴ء) اور ان کے ایک یہودی عقیدت مند کا واقعہ بیان فرمایا کہ شیخ کی روحانی عظمت سے متاثر ہو کر ایک یہودی اُن کے پاس آتا تھا۔ جب شیخ نے انتقال کیا تو وہ یہودی اُن کے مزار کی زیارت کے لیے آنے لگا۔ ایک دن کچھ مسلمانوں نے یہودی سے کہا کہ آپ شیخ کی زندگی میں اُن سے عقیدت رکھتے تھے اور اب اُن کی موت کے بعد بھی اُس عقیدت میں کمی

---

[1] جوامع الحکایات ولوامع الروایات۔ اقتباس کے انگریزی ترجمہ کے لیے دیکھئے:

Perso-Arabic Sources on the Life and Condition in the Sultanat of Delhi, op. cit, PP. 13-14

حضرت فضیل بن عیاض کا شمار دور اول کے اکابر صوفیاء میں ہوتا ہے۔ ان کی عظمت اور بزرگی اس طرح کے واقعات کی محتاج نہیں ہے۔ ان کی طرف انھیں منسوب کرنے سے پہلے مزید تحقیق کی ضرورت محسوس ہوتی ہے (جلال الدین)

واقع نہیں ہوئی لہٰذا اُن کی قبر کی زیارت کے لیے آتے ہیں۔ اگر آپ کو شیخ پر ایمان تھا تو ان کی پیروی میں آپ اسلام قبول کیوں نہیں کرتے ؟ اس بات کو سُن کر یہودی نے جواب دیا: "کیا مسلمان بنوں ؟ اگر اسلام وہ ہے کہ جس پر بایزید عمل پیرا تھے تو میں اس کا اہل نہیں ہوں یعنی میری طاقت سے باہر ہے اور اگر اسلام یہ ہے کہ جس کی تم لوگ پیروی کرتے ہو تو مجھے ایسے اسلام سے شرم آتی ہے"۔[1]

ایک اور یہودی جو کہ اسلام قبول کرنے کے بعد پیر طریقت کی حیثیت سے اُبھرے شیخ ابوالبرکات متوفی ۱۱۶۵ء ہیں۔ یہ زندگی کے آخری زمانہ میں مسلمان ہوئے تھے۔ لیکن شوق و ذوق کی بنا پر فلسفہ تصوّف پر بہت جلدی دسترس حاصل کر لی تھی۔ ان کا بھی اسلامی تصوف کی تاریخ میں ایک عظیم مفکر کی حیثیت سے نام آتا ہے۔[2]

گیارہویں صدی عیسوی کے عظیم صوفی بزرگ شیخ ابوسعید ابوالخیر (م ۱۰۴۹ء) کے احوال میں سدید الدین محمد عوفی نے لکھا ہے کہ نیشاپور کے ایک امیر شیخ ابو محمد جوینی جو کہ شیخ کے معتقد نہیں تھے اور اُن کے طور طریقوں پر معترض رہتے تھے اُن کی ملازمت میں ایک یہودی تھا جو کہ اُن کی املاک کا انتظام کرتا تھا۔ اس کی راست بازی سے ابو محمد جوینی متاثر ہو کر اس کا لحاظ کرتے تھے اُن کی یہ بھی خواہش تھی کہ یہودی اسلام قبول کر کے ان کا ہم مذہب بن جائے۔ اس سلسلے میں انھوں نے یہودی کی ترغیب کے لیے اس کو پیش کش کی کہ وہ اس کو اپنی جائداد کا ایک تہائی حصہ دے دیں گے اگر وہ اسلام قبول کر لے۔ لیکن دنیاوی منفعت کی خاطر یہودی اپنا مذہب چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوا۔ ایک دن وہی یہودی شیخ کی خانقاہ کے سامنے سے گذر رہا تھا۔ اس وقت شیخ اپنا وعظ شروع کرنے والے تھے۔ یہودی کے دل میں شیخ کا وعظ سننے کا شوق پیدا ہوا۔ اس نے سوچا کہ وہ ایک ہی ہے اور اگر خانقاہ میں داخل ہو کر وعظ سنے گا تو کوئی اس کو شناخت نہیں کر پائے گا۔ وہ اندر جا کر ایک ستون کے پیچھے بیٹھ گیا۔ شیخ ابوسعید

---

[1] میر حسن سجزی۔ فوائد الفواد۔ (نول کشور پریس) ص ۱۸۴

[2] ملاحظہ کیجئے ہنری کوبان A vicena and the visionary Recital Eng. tr. W.R. Trask, New-yark, 1960, PP-89–90.

ابوالخیر نے اس کو آواز دی اور کہا کہ وہ سامنے آجائے۔ یہودی پر ایک کیفیت طاری ہوگئی اور وہ سامنے آگیا[1] اس کے جسم پر لرزہ طاری تھا۔ اُس نے شیخ کے دست مبارک پر اسلام قبول کرلیا۔ شیخ نے اس سے کہا کہ وہ اپنے آقا ابو محمد جوینی کے پاس جاکر اُس سے شعائر اسلام سیکھ لے اور یہ بھی بتا دے کہ ہر بات کے لیے ایک وقت متعین ہے۔ وقت آنے پر میں نے اسلام قبول کرلیا ہے۔ اب ضرورت نہیں ہے کہ وہ اس کو اپنی جائداد کا تہائی حصّہ دیں۔ یہ واقعہ سُن کر ابو محمد جوینی شیخ کا قائل ہوگیا۔[2]

شیخ محمد حسین گیسو دراز کی ملفوظات جوامع الکلم میں ایک یہودی کا تذکرہ خواجہ سالاری کے حوالہ سے اس طرح آتا ہے کہ شیخ نظام الدین اولیاء کے جماعت خانہ میں ایک مسافر ایک کونے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے پاس خواجہ اقبال آئے اور اس سے پوچھنے لگے کہ اس نے شیخ سے کیا کہا تھا کہ وہ برابر رو رہے ہیں۔ ان کے آنسو رکتے ہی نہیں اور حالت غیر معمولی ہے۔ مسافر نے بتایا کہ جب اُن کی شیخ سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے اُن سے سفر کے واقعات پوچھے۔ پھر انھوں نے پوچھا کہ کیا انھوں نے خواجہ محمد بکا کو بھی دیکھا تھا۔ اس پر مسافر نے شیخ کو بتایا تھا وہ ایک نو مسلم یہودی صوفی سے وابستہ ہو گئے تھے۔ یہ یہودی اور اس کی ہمشیرہ مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے۔ یہودی زہد اور تقویٰ کی زندگی بسر کرنے لگا اور پیر طریقت کی حیثیت سے مشہور ہوگیا۔ شہر کے لوگوں نے اس سے متاثر ہوکر اس کے لیے ایک خانقاہ بنوا دی۔ خواجہ محمد بکا ایک امیر سوداگر کے بیٹے تھے لیکن اُن کو مذہب سے اس قدر دلچسپی ہوئی کہ وہ مال و دولت سے متنفر ہو گئے۔ وہ سب ترک کر کے نو مسلم یہودی شیخ سے وابستہ ہو گئے اور اس کی خانقاہ کے ایک حُجرے میں رہنے لگے۔ جب یہودی بیمار ہوا تو وہ اور اس کی ہمشیرہ تیمار داری کرنے لگے۔ ایک دن جب وہ اپنے پیر کے حجرے کے نزدیک

---

[1] یعنی حضرت ابوسعید نے اس اجنبی یہودی کو پہچان لیا۔ ممکن ہے اس کے نام سے اسے آواز دی ہو اور اس کے سلسلہ میں ابو محمد جوینی کی کوششیں بھی ان پر از خود منکشف ہوگئی ہوں۔ اس طرح کے خارق عادت واقعات کے بغیر صوفیا کرام کے تذکرے مکمل نہیں ہوتے۔ (جلال الدین)

[2] سدید الدین محمد عوفی جوامع الحکایات ولوامع الروایات کا انگریزی ترجمہ کیے لیے دیکھئے۔
Perso-Arabic Sources on the Life and Conditions in the Sultanat of Delhi P. 21.

پہنچے تو انھوں نے پیر کو اپنی ہمشیرہ سے کہتے ہوئے سنا کہ اس کا آخری وقت آپہنچا ہے اور وہ گواہی دے گی کہ وہ اپنے آبائی دین پر ختم ہو رہا ہے۔ یہ سن کر خواجہ محمد یکا زیادہ متوجہ ہو کر اُن کی گفتگو سننے لگے۔ انھوں نے یہودی کی بہن کو کہتے ہوئے سنا "بھائی ایسا مت کہو۔ یہودی نے پھر کہا کہ وہ اپنے آبائی دین پر ختم ہو رہا ہے۔ پھر بہن نے کہا" ای بدبخت ایسا مت کہو۔" لیکن یہودی نے قرآن، پیغمبر اسلام اور شعائرِ اسلام سے انکار کرتے ہوئے انتقال کیا۔ شیخ آخرت کے ڈر سے رونے لگے کہ آدمی کا زندگی بھر کا زہد و تقویٰ بیکار ہو جاتا ہے اگر اس کا صحیح ایمان پر خاتمہ نہ ہو[1]

منہاج سراج جوزجانی اور سولہویں صدی کے مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ خراسان، غور اور غزنی کے علاقوں میں یہودی تجار خاصی بڑی تعداد میں آباد تھے۔ غوری سلاطین کے پایۂ تخت فیروزکوہ اور غور کے علاقہ میں یہودی تجار کی آبادی گیارہویں صدی عیسوی سے معلوم ہوتی ہے حالانکہ منہاج سراج جوزجانی مقبول عام روایت کی بنا پر غوری سلاطین اور یہودی تجار کے دوستانہ تعلقات اُن کے جدامجد امیر بنجی شنبانی کے عہد سے بتلاتا ہے[2] تیرہویں صدی عیسوی کی تیسری دہائی کے آغاز پر جب چنگیز خاں اور منگولوں کا تسلط وسط ایشیا، قلمرو غزنی اور خراسان (موجودہ افغانستان) پر ہو گیا۔ فیروزکوہ اور دوسرے شہر نیست و نابود ہو گئے تو مسلم خواص کی طرح یہودی تجار بھی مہاجر کی حیثیت سے ہندوستان آ گئے ہوں گے کیونکہ تیرہویں صدی عیسوی کے بعد شمالی ہندوستان میں مسلمانوں میں ایک علٰحدہ برادری بنی اسرائیلان موجود تھی۔

پندرہویں صدی عیسوی کی ابتدا میں ایک عرب نومسلم یہودی صوفی شیخ بدیع الدین ملقب بشاہ مدار ہندوستان تشریف لائے۔ یہ بڑے عالم تھے۔ یہودی، عیسائی اور اسلامی مذہبی روایات سے بہرہ ور ہونے کے علاوہ اسلامی تصوّف کے مختلف مکاتب فکر کا بھی علم رکھتے تھے۔ جب ہندوستان میں داخل ہوئے تو تھوڑے ہی عرصہ میں ہندوی میں اس قدر صلاحیت پیدا کر لی کہ اس میں وعظ کرنے لگے۔ وہ اپنے روحانی کمال کی بنا پر

---

[1] جوامع الکلم۔ ص ص ۲۲۴ تا ۲۲۵۔

[2] طبقات ناصری۔ جلد اول۔ ص ص ۳۲۵ تا ۳۲۶۔
۴۲۵

صفِ اول کے درویش تصور کیے جانے لگے۔ وہ جس شہر سے گذرتے وہاں مریدوں کی ایک کثیر تعداد چھوڑ جاتے تھے۔ لہٰذا مختصر سی مدت میں سلسلہ مداریہ کی ہندوستان میں داغ بیل پڑ گئی تھی۔ معتبر تاریخی ماخذ سے آپ کے بارے میں جو مختصر تفصیل ملتی ہے اُس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بحیثیت ایک روحانی پیشوا کے انھوں نے ایک اہم رول ادا کیا۔ سترہویں صدی عیسوی کے اُن کے سوانح نگار شیخ عبدالرحمن چشتی نے اُن کے احوال میں مقبول عام افسانوی قصّوں اور تاریخی واقعات کو خلط ملط کر دیا ہے۔ لہٰذا افسانوی روایات سے تاریخی واقعات کو علیٰحدہ کرنا کافی دقت طلب کام ہو گیا ہے۔ معاصر ماخذ اور سولہویں صدی عیسوی کی معیاری کتابوں میں شاہ مدار کا ذکر اگرچہ مختصر ہے لیکن اس کے باوجود ان کی روحانی عظمت اور مذہبی رواداری پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔ یہ ذکر اُن کے صحیح خد و خال کو سمجھنے میں بھی معاون ہوگا۔ ذیل کی سطور میں اس کا اختصار کے ساتھ تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔

شاہ مدار کے خلیفہ قاضی محمود کنتوری کی تالیف "رسالہ ایمان محمودی" (مفقود) کے مطابق شاہ مدار کے والد ابو اسحاق یہودی تھے اور اپنے مذہب کے پابند تھے۔ وہ شام کے باشندے تھے۔ اُن کا شجرہ نسب حضرت موسیٰ کے بھائی ہارون سے ملتا تھا۔ شاہ مدار ان کی تنہا اولاد تھے۔ والد نے اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت کا معقول انتظام کیا۔ وہ تورات اور یہودی شریعت سے جلد ہی روشناس ہو گئے۔ والدین کے انتقال کے بعد شاہ مدار کو دوسرے مذاہب کے مطالعہ کا شوق ہوا۔ خاص طور پر وہ اسلام سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گئے۔ شام کے پیر طریقت شیخ طیفور شامی کے حلقۂ مریدین میں داخل ہو کر اُن سے سلوک کی تعلیم حاصل کی[۱]۔ شام سے ہجرت کر کے مکہ اور مدینہ کی زیارت کی۔ اس کے بعد عراق آئے بغداد، نجف اور دوسرے مقامات پر بزرگانِ دین کی قبور کی زیارت کی اور پھر دوسرے ممالک کے سفر پر روانہ ہو گئے۔

حجاز کے زمانہ قیام میں شاہ مدار کی ملاقات شیخ اشرف جہانگیر سمنانی سے ہوئی۔ آخر الذکر اُن کی روحانی عظمت سے متاثر ہوئے۔ لطائف اشرفی (ملفوظات) کے لطیفہ ۱۴ (چودہ) میں شیخ اشرف جہانگیر سمنانی شاہ مدار کے بارے میں فرماتے ہیں "حضرت شیخ بدیع الدین الملقب

---

[۱] عبدالرحمن چشتی۔ مراۃ مداریہ۔ مخطوطہ خدا بخش لائبریری۔ اوراق ۳ب تا ۷ الف۔

[۲] شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ اخبار الاخیار۔ احمدی پریس دہلی۔ ص ۱۶۶۔

بشاہ مدار اویسی (درویش) تھے۔ عالی مشرب کے حامل تھے اور بہت سے نادر علوم جیسے ہیمیا، سیمیا، اور ریمیاء پر کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ مکہ اور مدینہ کے سفر میں ہم ساتھ تھے۔ لہٰذا ایک دوسرے سے مستفیض ہوئے تھے[۱]

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے مطابق وہ بحری راستہ سے گجرات آئے جہاں پر مختصر قیام کے بعد اجمیر کے لیے روانہ ہو گئے۔ اجمیر میں بھی اُن کا قیام مختصر رہا۔ وہاں سے شہر محمد آباد عرف کالپی کے لیے روانہ ہو گئے۔ ۱۳۹۸ء میں امیر تیمور کے حملہ سے دہلی کی تباہی کے بعد شمالی ہندوستان میں جو علمی اور ثقافتی مراکز اُبھرے ان میں جونپور، شادی آباد عرف مانڈو اور احمد آباد کے علاوہ شہر کالپی بھی تھا۔ پندرہویں صدی عیسوی کے آغاز پر کالپی کو ملک زادہ محمود ترک نے اپنی چھوٹی سی خود مختار سلطنت کا پایہ تخت بنایا اس میں قلعہ، حصار، محلات اور جامع مسجد کی تعمیر کرکے ایک حسین شہر کی شکل دے دی تھی۔ علاوہ ازیں دہلی سے ہجرت کرنے والے علماء، فضلاء، مشائخ اور اہل حرفت کی اعانت کرکے اُن کی بڑی تعداد کو کالپی میں سکونت اختیار کرنے کا موقع فراہم کیا۔ ان کی موجودگی نے کالپی کو علم و ثقافت کا مرکز بنا دیا تھا۔

شاہ مدار کالپی میں سلطان محمود ترک کے بیٹے قادر شاہ کے ۱۴۱۲ء میں تخت نشین ہونے کے بعد وہاں پہنچے۔ اُن کے مریدوں نے اُن کے قیام کے لیے وہاں خانقاہ تعمیر کردی۔ جلد ہی اُن کی شہرت شہر اور شہر کے باہر پھیل گئی۔ ہندو مسلمان اُن سے فیض یاب ہونے کے لیے اُن کی خانقاہ میں آنے لگے۔ شاہ مدار کی مقبولیت اور شہرت سے متاثر ہو کر سلطان قادر شاہ بھی اُن سے ملاقات کا خواہش مند ہوا لیکن جب وہ شاہ مدار کی خانقاہ پر پہنچا تو شاہ مدار کے مریدوں نے سلطان سے کہا یہ وقت ان کی ملاقات کا نہیں ہے۔ سلطان وہاں سے مایوس لوٹا۔ بعد میں کسی نے سلطان کو بتایا کہ جب وہ خانقاہ پر پہنچا تھا تو اس وقت شاہ مدار ہندو جوگیوں سے محوِ گفتگو تھے۔ سلطان نے ناراض ہو کر شاہ مدار کو کالپی چھوڑنے کا حکم دے دیا۔ لہٰذا شاہ مدار کالپی سے روانہ ہو کر سلطنت شرقی کے پایہ تخت جونپور پہنچ گئے[۲]

---

[۱] لطائف اشرفیہ۔ مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری۔ علی گڑھ لطیفہ ۱۴۔
[۲] اخبار الاخیار۔ ص ص ۱۶۶ تا ۱۶۷۔

اس عہد کا ایک معاصر کتبہ چندیری کی ایک باولی میں ملا ہے۔ اس میں کندہ عبارت ہے کہ باولی کی تعمیر رفاہ عام کے لیے سلطنت مالوہ کے وزیر طفی نے اپنے روپیہ سے ۱۴۲۳ء میں کرائی تھی اور طفی شاہ مدار کے مرید تھے۔ شاہ مدار کے بارے میں متقی اور پرہیزگار درویش کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں[1] اسی طرح ضلع پٹنہ کے قصبہ ہلسہ میں شاہ مدار کے خلیفہ میران سید جمن مداری کے مقبرہ کے کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ مدار کے مریدین میں عوام اور خواص دونوں شامل تھے اور حکمراں طبقہ پندرہویں اور سولہویں صدی میں شاہ مدار اور ان کے خلفاء سے عقیدت رکھتا تھا[2] علاوہ ازیں لکھنؤ کے شاہ میناجو کہ شاہ مدار کے زمانہ میں بچے تھے۔ وہ شاہ مدار کا تذکرہ سلطان المشائخ کے لقب سے کیا کرتے تھے[3] ملا عبدالقادر بدایونی "نجات الرشید" میں شاہ مدار کا تذکرہ اسلام کے اہم ترین صالحین میں کرتے ہیں۔ اگرچہ شاہ مدار سے متعلق بدایونی کی شامل کردہ روایات میں بھی خوارق العادات اور ناقابل یقین عناصر شامل ہیں لیکن بہر حال ان روایات سے شاہ مدار کی روحانی عظمت اور صلاحیتوں پر ایک گونہ روشنی پڑتی ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ملا عبدالقادر بدایونی بڑے محتاط عالم دین اور تاریخ داں تھے۔ وہ مورخ کے فرائض اور ذمہ داریوں سے واقف تھے۔ انھوں نے اپنی تالیفات منتخب التواریخ کی تین جلدوں اور نجات الرشید میں بڑی چھان بین کر کے تاریخی واقعات اور روایات کو شامل کر کے معیاری علمی تحقیق کا نمونہ پیش کیا ہے۔ یقیناً شاہ مدار کے متعلق بھی اُن کے مآخذ قدیم اور معتبر رہے ہوں گے۔ بدایونی کے مطابق شاہ مدار دل نشیں خوبیوں کے حامل تھے۔ وہ ایک فصیح البیان مقرر تھے اور اُن کا چہرہ نور سے اس قدر منور رہتا تھا کہ دیکھنے والوں کی اس پر نظر جم نہیں سکتی۔ بدایونی نے شاہ مدار اور جونپور کے

---

[1] ملاحظہ کیجئے: Epigraphia Indica: Arabic and Persian Supplement, ed. Z. U. A. Desai, 1964, P. 64

[2] ملاحظہ کیجئے قیام الدین احمد Corpus of Arabic and Persian Inscriptions of Bihar Patna, 1973, P. 132

[3] ملفوظات شاہ مینا۔ مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری۔ ورق ۶۴ الف۔

ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے درمیان خط وکتابت کا بھی ذکر کیا ہے جو کہ قابلِ نقل ہے۔ بدایونی لکھتے ہیں: " ایک مرتبہ ملک العلماء شہاب الدین دولت آبادی نے اس خطہ کے سلطانِ درویشاں بدیع الحق والملتہ والدین شاہ مدار قدس اللہ سرہ العزیز کو خط لکھا اور پوچھا کہ حدیث (نبوی) کے مطابق علماء انبیاء کرام کے وارث ہیں لہٰذا ایسا ہی تصور کرنا چاہیے۔ شاہ مدار نے جواب میں لکھا: ایسا نہیں ہے کیونکہ میراث ہر وارث کو خود بخود بغیر کسی کاوش کے ملتی ہے۔ آپ لوگ یعنی علماء تحصیل علم کے لیے بڑی جد وجہد کرتے ہیں۔ تب اس کے نتیجہ میں علم کا کچھ حصہ نصیب ہوتا ہے۔ دراصل رسول اللہ کے وارث اہلِ فقر ہیں جن کو بغیر کوشش کے علمِ الٰہی نصیب ہوتا ہے[1]۔"

کچھ عرصہ بعد ملک العلماء شہاب الدین اور شاہ مدار میں شرعی امور کے سلسلے میں اختلاف رائے ہو گیا۔ اول الذکر کے ایماء پر جونپور کے سلطان ابراہیم شرقی نے شاہ مدار سے تعرض کیا لہٰذا وہ جونپور سے ہجرت کر کے مکن پور آ کر سکونت گزیں ہو گئے۔ اس زمانہ میں مکن پور خطۂ قنوج میں داخل تھا۔ اُن کے مریدوں نے اُن کے لیے آبادی سے علیحدہ خانقاہ تعمیر کر دی تھی۔ اگرچہ مکن پور ایک غیر معروف اور غیر اہم گاؤں تھا لیکن شاہِ مدار کے آنے سے وہ ایک مشہور مقام بن گیا۔ وہاں بھی مختلف مقامات سے لوگ شاہ مدار سے فیض یاب ہونے کے لیے کثیر تعداد میں آنے لگے۔ اُن کے دیدار اور ملاقات کے لیے ہفتہ میں صرف ایک

---

[1] مُلّا عبدالقادر بدایونی، نجات الرشید، بتصحیح سید معین الحق، لاہور ۱۹۷۲ء۔ ص ۱۴۳۔

حدیث کا یہ مفہوم عجیب سا ہے۔ اس میں تو کہا یہ گیا ہے کہ انبیاءؑ درہم و دینار چھوڑ کر نہیں جاتے بلکہ علم چھوڑ کر جاتے ہیں، جو یہ علم حاصل کرے وہی ان کا وارث ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انبیاءؑ کی وراثت بغیر جد وجہد کے مل جاتی ہے۔ مال وجائداد کا تو آدمی بغیر کسب کے وارث ہوتا ہے لیکن علم وفضل کا وارث سعی وجہد سے ہوتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ فلاں شخص علم وفضل میں اپنے باپ کا وارث ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ چیز اسے خود بخود مل گئی ہے اور اس کے لیے اس نے کوئی کوشش نہیں کی۔ حدیث میں اسی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ انبیاءؑ کی وراثت محنت اور جد وجہد سے حاصل ہوگی بغیر محنت کے اس کا حصول ممکن نہیں ہے۔ حدیث میں علم کی راہ میں جد وجہد کی ترغیب ہے اور یہاں اس کی نفی کی جا رہی ہے۔ (جلال الدین)

دن معین تھا۔ اُس دن لوگوں کا اس قدر ازدحام رہتا تھا کہ ایک میلہ لگ جاتا تھا۔ خانقاہ کے سامنے ایک وسیع میدان تھا جس میں شاہ مدار کو دیکھنے کے لیے لوگ جمع ہو جاتے تھے۔ جب شاہ مدار، ہجوم کے سامنے آتے تھے تو ان کے چہرے پر نقاب پڑا ہوتا تھا۔ جیسے ہی وہ نقاب ہٹاتے تھے اور لوگوں کی نظریں اُن کے چہرہ تابناک پر پڑتی تھیں تو وہ فوراً سربسجود ہو جاتے تھے۔ اُن کی تقریر میں ہر حاجت مند کو وہ سب مل جاتا تھا جس سے اس کی پوری تسلی ہو جاتی تھی۔ کسی کو شاہ مدار کو اپنی حاجت بتانے کی ضرورت نہیں رہتی تھی۔ علاوہ ازیں اُن کی تقریر مربوط اور وضاحت سے بھرپور ہوتی تھی۔ تقریر کے اختتام پر اپنے حجرے میں واپس چلے جاتے تھے۔ یہ بھی ملتا ہے کہ کبھی شخص نے نہ تو ان کے لیے کھانا پکتے ہوئے دیکھا اور نہ ہی کسی نے اُن کے لباس کو دھوتے ہوئے دیکھا۔ کہتے ہیں کہ قنوج کے قاضی کو جب یہ باتیں معلوم ہوئیں تو وہ اُن کے پاس احتساب کے لیے آیا۔ جب وہ مکن پور پہنچا تو دربار عام کا وقت تھا۔ لوگوں کے ہجوم میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھڑا ہو گیا جب شاہ مدار نے اپنا نقاب چہرے سے ہٹایا تو سب لوگوں کی طرح قاضی بھی سجدے میں گر گیا۔ مجلس کے ختم ہونے پر شاہ مدار سے ملا اور کہا کہ اسے بعض مسائل پر گفتگو کرنی ہے اور وہ اُن سے ان کا جواب چاہتا ہے۔ ایک مسئلہ سجدہ سے متعلق ہے کہ وہ اس کو کیسے روا رکھتے ہیں؟ شاہ مدار نے جواب دیا کہ وہ کسی سے نہیں کہتے (سجدہ کرنے کے لیے) جیسے کہ آپ نے بغیر میرے کہے ہوئے سجدہ کیا۔ قاضی محمود کو بڑا تعجب ہوا اور اُس نے اپنے مصاحبوں سے دریافت کیا کہ واقعی اس نے بھی سجدہ کیا تھا؟ مصاحبوں نے اثبات میں جواب دیا۔ اس کے بعد دوسرا مسئلہ پوچھا: کہ نماز جمعہ شعار اسلام ہے آپ شرکت کے لیے کیوں نہیں جاتے؟ شاہ مدار: میں نے اس علاقہ میں مستقل قیام کی نیت نہیں کی ہے۔" قاضی نے کہا: کئی سال سے آپ اس علاقہ میں ہیں۔ آپ مسافر کے زمرہ میں کس طرح آ سکتے ہیں۔ شاہ: اگر آدمی کی کسی جگہ مستقل قیام کی نیت نہ ہو تو وہ اُس جگہ مقیم تصور نہیں کیا جا سکتا اور نیت کا معاملہ دل سے ہے۔ تیسرا سوال تھا۔ پیغمبروں نے کھانا کھایا ہے آپ کھانا کیوں نہیں کھاتے؟ شاہ مدار: "آپ کو کس طرح علم ہوا کہ میں کھانا نہیں کھاتا۔" قاضی نے کہا کہ بغیر غذا کے حیات ممکن نہیں ہے۔" پھر انھوں نے وہ کھانا شاہ کے سامنے رکھا جو کہ وہ بازار سے خرید کر لائے تھے اور کہا تھا چند لقمہ کھا لیجیے تا کہ تصدیق ہو جائے۔ شاہ مدار:

یہ لازم نہیں ہے کہ آپ جو بازار سے کھانا لائے ہیں اس کو کھاؤں کیونکہ ہمارا بھی بازار ہے اور وہاں کی غذا سے ہمارے یہاں قوت آتی ہے[۱]۔

۱۴۳۶ء میں شاہ مدار کے انتقال کے بعد اُن کی درگاہ مکن پور میں خاص و عام کے لیے زیارت گاہ ہوگئی۔ دستورِ زمانہ کے مطابق دوسرے بڑے صوفیا کی درگاہوں کی طرح فرماں روایانِ وقت اس درگاہ پر بھی اگر اُن کو اس سمت سے گذرنا پڑتا تھا تو حاضری دینا ضروری سمجھتے تھے۔ سب سے پہلا بادشاہ جس نے درگاہ کے مصارف پورے کرنے کے لیے کئی گاؤں وقف کیے شیر شاہ کا بیٹا اور جانشین اسلام شاہ سور (۱۵۴۵ء تا ۱۵۵۳ء) تھا[۲]۔ اورنگ زیب ۱۶۵۸ء میں شاہ شجاع سے جنگ کرنے کے لیے کھجوا کی طرف جا رہے تھے تو انھوں نے بھی راستہ میں حسبِ دستور شاہ مدار کی درگاہ پر حاضری دی۔ خوافی خاں کے الفاظ میں "شہنشاہ نے خواص میں منتخب حضرت سید بدیع الدین الملقب بشاہِ مدار کے روضہ کی زیارت کی اور دس ہزار روپیہ درگاہ سے متعلق لوگوں کی اعانت کے لیے دیئے[۳]۔

شاہ مدار کے سوانح نگار کے مطابق سترہویں صدی عیسوی میں مسلم خواص میں شاہ مدار کی شخصیت متنازعہ فیہ ہوگئی تھی۔ بعض علما اُن پر زندیق اور ملحد ہونے کا شک کرتے تھے اُن کو شیعہ سمجھتے تھے[۴]۔ لیکن سوانح نگاران الزامات کی تردید کرتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ پندرہویں اور سولہویں صدی کے مآخذ کے مطابق اُن کے عظیم درویش بزرگ ہونے میں لوگوں کو شک نہیں تھا۔

شاہ مدار کے اولین اور محبوب خلفا میں قاضی شہاب قدوائی کے احوال سے متعلق جو تفصیلات ملتی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں پندرہویں صدی عیسوی کے آغاز تک یہودی کثیر تعداد میں دائرۂ اسلام میں داخل ہو چکے تھے اور وہ دوسرے مسلمانوں کی طرح

---

[۱] نجات الرشید، ص ۱۷۷۔ اس طرح کے واقعات کی مزید تحقیق ہونی چاہیے۔ تحقیق کے بعد بھی صحیح ثابت ہوں تو جو باتیں خلافِ شرع ہیں ان کو رد کر دینا چاہیے۔ (جلال الدین)

[۲] تذکرۃ المتقین، مرتبہ سید محمد امیر حسن، کانپور ۱۳۲۲ھ ص ۱۷۲۔

[۳] خوافی خاں، ہسٹری آف اورنگ زیب۔ انگریزی ترجمہ معین الحق، کراچی ۱۹۷۵ء ص ۵۲۔

[۴] عبد الرحمٰن چشتی، مراۃ مداریہ، ورق ۱۲۵ الف۔

اپنی علیحدہ برادری رکھتے تھے۔ اس برادری کے افراد اسلامی اور غیر اسلامی علوم پر دسترس رکھتے تھے اور شائستگی اور تہذیب کے لیے مشہور تھے۔ عبدالرحمٰن چشتی قاضی شہاب قدوائی کو بنی اسرائیل قوم کا فرد بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ صاحب علم و فضل ہونے کے علاوہ خوبصورت اور وجیہہ نوجوان تھے۔ عین جوانی میں اسلام سے بے پناہ دلچسپی اور دینی جذبہ کی بنا پر دنیاوی عیش و عشرت سے متنفر ہو کر روحانی کمال کے حصول کے لیے گھر سے رخصت ہو کر پیر کامل کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے۔ جب لکھنؤ میں اُن کی ملاقات شاہ مدار سے ہوئی تو ان کے گرویدہ ہو کر ان کے حلقہ مریدین میں شامل ہو گئے۔ پیر کی صحبت میں رہ کر کمالاتِ صوری و معنوی کے حصول میں لگ گئے۔ شاہ مدار کے جونپور کے زمانۂ قیام میں بھی وہ اپنے پیر کی نگرانی میں عبادت اور ریاضت میں مشغول رہے۔ اُن کا شمار شاہ مدار کے عظیم خلفا میں ہوتا تھا۔[۱]

اس ضمن میں پندرہویں اور سولہویں صدی عیسوی کے دو مزید دانشوروں کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ خواجہ اویس گوالیاری اور مُلّا طرزی (شاعر) تھے۔ اِن کے متعلق جو تفصیلات ملتی ہیں اُن سے بھی بنی اسرائیلی مسلمانوں کی برادری اور اُن کے مہذب ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ یہ دونوں بنی اسرائیلان سے متعلق تھے اور فرماں روانِ وقت کے ندیم اور درباری تھے۔ خواجہ اویس گوالیاری کو علوم عربیہ پر دسترس کے علاوہ علمِ نجوم، علم ہیئت، رمل اور صنعت اصطرلاب کی صنعت میں کمال حاصل تھا۔ وہ لودی سلاطین کے عہد سے مغلوں کے ابتدائی عہد تک ایک سائنس داں کی حیثیت سے مقبول تھے کیونکہ ہمایوں بادشاہ علمِ نجوم اور علم ہیئت میں دلچسپی رکھتا تھا اس لیے اس نے خواجہ اویس گوالیری کی بڑی قدردانی کی۔

اکبر بادشاہ کے عہد میں بھی وہ مغل دربار سے وابستہ رہے۔ مُلّا قطعی ہروی نے اُن سے متعلق اکبر کے عہد کا ایک واقعہ قلم بند کیا ہے جس سے اُن کی علم نجوم اور رمل میں مہارت پر روشنی پڑتی ہے۔ مُلّا قطعی لکھتے ہیں کہ اکبر کے عہد میں ولایت (یعنی خراسان) سے ایک نجومی ہندوستان آئے اور اکبر کے دربار سے منسلک ہو گئے۔ ایک دن دربار میں

---

[۱] مرآۃ مداریہ، ورق ۲۴۴ ب

بادشاہ کے حضور میں کسی شخص نے ایک خوبصورت گائے نذر کے طور پر پیش کی۔ بادشاہ نے نووارد نجومی سے کہا کہ وہ بتائیں کہ "گائے کے پیٹ میں جو بچہ ہے وہ نر ہے یا مادہ اور اس کا رنگ کیا ہے؟" نجومی: "بچہ نر ہے اور اُس کا جسم سُرخ لیکن صرف اس کی پیشانی پر سفید نشانی ہے۔" اکبر نے خواجہ اویس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا کہ ان کا کیا خیال ہے؟ خواجہ اویس نے ذرا توقف کے بعد جواب دیا: جو کچھ بتایا گیا ہے قریباً صحیح ہے۔ لیکن بچہ کی دُم سفید ہے اور وہ اس کی پیشانی پر لپٹی ہوئی ہے ورنہ پیشانی بھی سرخ ہی ہے۔" موجود درباریوں نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ حقیقت جاننے کے لیے گائے کو ذبح کرایا جائے اور دیکھا جائے کہ کون صحیح ہے۔ جب گائے کو ذبح کر کے اس کا بچہ پیٹ سے باہر لایا گیا تھا تو خواجہ اویس کا بتایا ہوا صحیح پایا گیا۔ اس واقعہ کے بعد اکبر بادشاہ خواجہ کے کمالات کا پہلے سے زیادہ معترف ہو گیا اور اُن کی عزت اور قدردانی میں مزید اضافہ ہوا۔[1]

خواجہ اویس کے نواسے مُلّا طرزی کا تعلق بھی بنی اسرائیل کی نسل سے تھا وہ بڑے عالم و فاضل تھے۔ اُن کے جدِ امجد ملّا علی احمد اپنی علمی فضیلت اور نیکی اور تقویٰ کی بنا پر بڑے محترم بزرگ تھے۔ مُلّا قطعی ان کے احوال میں بنی اسرائیل کے مسلمانوں کے سلسلے میں رقم طراز ہیں کہ اس جماعت کے لوگ درویش نہاد، اولیاء صفت اور خوش طبع ہوتے ہیں۔" مُلّا طرزی ایک خوش گو شاعر تھے اور اکبر کے دربار سے وابستہ تھے۔ اُن کا دیوان ان کے زمانہ میں مقبول تھا کیونکہ اُن کے کلام میں جدّت طرازی اور ندرتِ فکر تھی۔ مُلّا طرزی کا ایک لمبا قصیدہ اور چند غزلیں تذکرہ مجموعہ شعرائے جہانگیر شاہی میں شامل ہیں۔[2]

---

[1] مُلّا قطعیؔ ہروی، تذکرہ مجموعہ شعرائے جہانگیر شاہی، مرتبہ محمد سلیم اختر کراچی ۱۹۷۹ء ص ۶۴۔

گائے کے پیٹ میں جو بچہ تھا اس کے بارے میں اتنی باریک تفصیلات سے ایک نجومی اور خواجہ اویس واقف ہو گئے جب کہ قرآن مجید میں ہے کہ "یعلم ما فی الارحام" اللہ جانتا ہے کہ رحم میں کیا ہے؟ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ رحم مادر میں جو کچھ ہے اس کا علم سوائے خدا کے کسی کو نہیں ہے؛ یہاں اس کی تشریح مقصود نہیں ہے؛ صرف یہ عرض کرنا ہے کہ ہمارے مورخین نے کیسی عجیب و غریب حکایات بغیر تحقیق کے قلم بند کر دی ہیں اور عقائد پر اس کے کتنے خراب اثرات پڑتے ہیں۔ (جلال الدین)

[2] ایضاً ص ص ۶۳۔۶۴۔

آخر میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ ہمارے عہدِ سلاطین دہلی سے متعلق ماخذوں میں خواجہ محمد یکا کے یہودی نژاد بیر کے علاوہ کسی دوسرے یہودی کے اسلام قبول کرنے کے بعد اس سے منحرف یا مرتد ہونے کا ذکر نہیں ملتا اس کے برعکس اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد وہ اسلامی شریعت کی پابندی کے شوق و ذوق سے سرشار ہوتے تھے ہمارے ماخذ سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ غالباً یہودی دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد اپنا قدیم آبائی پیشہ یعنی تجارت چھوڑ دیتے تھے۔ جو کچھ بھی مواد ہے اس کی بنا پر یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وہ یا تو درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے یا پھر حکومت کی ملازمت میں آجاتے تھے۔ اُن کی اولاد علم و فضل کی بنا پر حکومت کی طرف سے مِلک یعنی وجہ معاش کے طور پر گاؤں یا زمین حاصل کرتی تھی اور مسلم خواص (elite) کے دوسرے مستحق افراد کی طرح وہ بھی حکومت کی سرپرستی کے مستحق ہوجاتے۔ مختلف علوم کو زندہ رکھنے اور ان کو مزید فروغ دینے میں مسلم بنی اسرائیلان کا رول بھی خاصا اہم رہا ہوگا۔ لیکن اس سلسلے میں ہمارے ماخذ ہماری مدد نہیں کرتے۔

اعلان تحقیقاتِ اسلامی کو مسلسل ایسے خطوط ملتے رہتے ہیں جن میں نمونے کا پرچہ طلب کیا جاتا ہے۔ ایسے تمام احباب سے جو واقعی رسالہ کو خریدنے کی غرض سے دیکھنا چاہتے ہوں۔ درخواست ہے کہ وہ دو روپے کے ٹکٹ روانہ فرمائیں۔ ان کی خدمت میں ۱۹۹۲ء کا پہلا شمارہ سادہ ڈاک سے بھیج دیا جائے گا جس کی قیمت ۱۲ روپے ہے۔

۱۹۹۵ء کے پہلے شمارہ سے تحقیقاتِ اسلامی کی شرح خریداری حسب ذیل ہوگی۔

اندرونِ ملک ــــــ	قیمت فی شمارہ	۱۶ روپے
	سالانہ	۶۰ روپے
	لائبریری و ادارے	۸۰ روپے سالانہ
بیرونِ ملک ــــــ	انفرادی خریدار	۱۰ ڈالر/ ۳۰۰ روپے
	لائبریری و ادارے	۱۵ ڈالر/ ۴۵۰ روپے
پاکستان ــــــ	انفرادی	۱۲۰ روپے
"	ادارے	۱۵۰ روپے

ہنداسلامی تہذیب اور تصوّف

ڈاکٹر محمد مسعود عالم قاسمی

ہندوستان میں اسلام کی اشاعت اور اسلامی تہذیب و ثقافت کی ترویج جن حضرات کے ذریعہ ہوئی ان میں صوفیاء کرام کا ذکر نمایاں طور پر کیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندی مسلمانوں کی قابل لحاظ تعداد نے انہی صوفیاء کے ہاتھوں قبول اسلام کیا، اور ہندوستان کے بہت سے علاقوں میں انہی بزرگوں نے دین کی روشنی پھیلائی۔ چونکہ اشاعت دین کا ان کا اپنا انداز تھا اور لوگوں کی اصلاح و تربیت کا مخصوص طریقہ کار تھا، اس لیے انھوں نے جس تہذیب و ثقافت کو فروغ دیا۔ اس میں اس طریقہ خاص کا پورا اثر موجود ہے۔ چنانچہ ہندی مسلمانوں کے بہت سے افکار، خیالات، رسمیں اور رجحانات اسی طریقہ خاص کی مرہون منت ہیں۔ صوفیاء کرام کی مخلصانہ اور بے لوث خدمات کا اعتراف کرنے کے ساتھ ان کی خدمات کو قرآن وسنت اور مزاج شریعت کے آئینہ میں دیکھنا ضروری ہے، نیز مسلم سماج پر مرتب ہونے والے ان اثرات کو بھی اسی زاویہ نگاہ سے دیکھنا لازم ہے جو ارباب تصوف کے ذریعہ رونما ہوئے ہیں۔

تصوف کی ابتداء

تصوف اپنی ابتداء اور اصل کے لحاظ سے اسلام کے ان روحانی احکام سے ماخوذ ہے جن کو تزکیہ، اخبات، احسان اور تطہیر وغیرہ کے الفاظ سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس کے اعمال اور اوراد و وظائف بھی زیادہ تر قرآن وحدیث سے ماخوذ ہیں اور بظاہر اس کا مقصد بھی اسی مشن کو تقویت پہونچانا ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کی جانب سے سونپا گیا تھا۔ ابتدا اسلام میں تصوف نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور نہ اس طرح کا کوئی

نظام پایا جاتا تھا، تزکیہ یا تربیتِ نفس قرآن وحدیث کی مجموعی تعلیم وتربیت کا ایک پہلو تھا جو دوسرے پہلوؤں سے مربوط اور منسلک تھا، بعد میں اس نے ایک نظامِ فکر وعمل کی صورت اختیار کرلی اور اس نے بہت سی چیزوں کو اپنے اندر سمیٹ لیا۔ ڈاکٹر البرنصری نادر کے بقول "تصوف اپنی ابتداء میں دینی زندگی کی صورتوں میں سے ایک صورت تھی اسے افراد ہی اختیار کرتے تھے اور ان سے ان کے خاص اصحاب حاصل کرتے تھے پھر تدریج یہ منظم تحریک اور مدرسہ بن گیا جس سے اولیاء بن کر نکلنے لگے اور اس کے قواعد اور رسوم بن گئے"[1]

تصوف کی تاریخ کے دو نمایاں دور قرار دئے جاتے ہیں۔ پہلا ابتدائی عہد سے نویں صدی تک کا اور دوسرا نویں صدی کے بعد کا۔ پہلے دور میں تصوف محض میلانات ورجحانات پر مبنی تھا، اس کا کوئی نظام نہ تھا دوسرے دور میں اس نے الٰہیات کا اپنا نظام مرتب کرلیا اور اپنے خانقاہی طریقوں کی تنظیم کی۔ تصوف کو ایک طریقۂ حیات کی حیثیت دینے اور متعارف کرانے کے لیے صوفیاء نے کشادہ ذہنی کے ساتھ اسلام اور دوسرے مذاہب سے استفادہ کیا اور جہاں سے جو چیز مناسب ومعاون نظر آئی اسے اپنا لیا، یہ انتخاب واختیار بہرحال مناسبت ومشابہت اور تقویت ہی کی بنیاد پر کیا گیا۔ ایرانی دانشور ڈاکٹر قاسم غنی کہتے ہیں کہ :۔

"واقع امر این است کہ تصوف طریقہ	حقیقت یہ ہے کہ تصوف بہت ہی
مرکب وبسیار پیچ درپیچ است و منابع	پیچ درپیچ اور مرکب طریقہ ہے جس کے
مختلف ومتنوع داشتہ واز سرچشمہائے	منابع مختلف اور متنوع ہیں، اور اس نے
متعدد آبخوردہ است"[2]	بہت سے سرچشموں سے سیرابی حاصل کی ہے۔

تصوف کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات خاص کا روحانی پیکر کہا جاتا ہے اور بسا اوقات اسے سنتِ رسولؐ کے باطنی پہلو کی حیثیت سے متعارف کرایا جاتا ہے مگر موجودہ نظامِ تصوف میں سنت رسولؐ کی مکمل پابندی کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا بلکہ اگر یہ کہا جائے تو نامناسب نہ ہوگا کہ بعض حالات میں دریائے تصوف کی موجیں شریعت

---

[1] ڈاکٹر البرنصری نادر، التصوف الاسلامی ص ۱۲، بیروت۔

[2] ڈاکٹر قاسم غنی، بحث در افکار واحوال حافظ ۲/۴۴، تہران ۱۳۲۵ھ۔

کی دیواروں سے ٹکرانے لگتی ہیں۔ ایک اجنبی مشاہد کی حیثیت سے ڈاکٹر تارا چند بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ تصوف ایک پیچیدہ نظام حیات ہے وہ اس کی مثال اس دریا سے دیتے ہیں جس میں مختلف ملکوں کی چھوٹی چھوٹی ندیاں آکر ملتی ہیں اور اسے ایک بڑا دریا بنا دیتی ہیں وہ کہتے ہیں کہ:-

> "اس کا اصل سرچشمہ قرآن اور پیغمبر اسلامؐ کی زندگی ہے، مسیحیت اور نوافلاطونیت کے دھارے اسی میں آکر ملے اور اس کا حجم بڑھا، ہندومت اور بدھ ازم نے اس کو کئی نئے خیالات دئے اور قدیم ایرانی مذہب زرتشت اور مانی کے مذاہب نے بھی اسے اپنا حصّہ دیا"[1]

ابتداءِ اسلام میں نہ صرف یہ کہ تصوف اور صوفیاء کا وجود نہیں ملتا بلکہ اصحاب صفہ کے اندر بھی ایسی کوئی علامت نہ تھی جو بعد کے صوفیاء کے لیے وجہ جواز فراہم کرے۔ اس وقت دین داری اور تقویٰ کا معیار صحابیت اور بعد کے دور میں تابعیت تھی، دور ملوکیت میں زہاد اور عباد کے القاب معروف ہوئے اور اس کے بعد تصوف اور صوفیا کی اصطلاح رائج ہوئی۔[2]

ساسانی عہد کے اواخر اور اسلام کے اوائل میں دجلہ وفرات کے سواحل پر عراق وجزیرہ کے مسیحی رہبان اور نسّاک ترک دنیا کر کے خانقاہوں کو آباد کر رہے تھے اور شب و روز ریاضت میں مشغول رہتے تھے، وہ نفس کشی اور ترک لذات کے ذریعہ خود کو فنا کرتے، کھردرا اور تکلیف دہ لباس پہنتے تاکہ جسم تکلیف کے خوگر بنیں، ان حضرات کو "صوفی" اور ایسی خواتین کو "صوفیہ" کہا جاتا تھا۔[3] مسلمانوں میں سب سے پہلے یہ لقب ابو ہاشم کوفی کو ملا جو حضرت سفیان ثوریؒ کے معاصر تھے[4] حالانکہ فقہا اس طرز زندگی کو بدعت شمار کرتے تھے چنانچہ خود حضرت سفیان ثوری لباس تصوف پر تنقید کرتے اور اسے بدعت قرار دیتے تھے، حماد بن سلیمان نخعی جب بصرہ آئے تو ان کے سامنے فرقد سنجی لباس تصوف میں آئے تو انھوں نے فرمایا 'اس نصرانی لباس کو اتار ڈالو'[5] مگر یہ طریقے آہستہ آہستہ عراق و

---

[1] اسلامی تہذیب کا ہندوستانی سماج پر اثر ص۹ [2] بحث در آثار و افکار و احوال حافظ ۲/۳۷

[3] سعید نفیسی، سرچشمہ تصوف در ایران ص۱۴، تہران ۱۹۶۵ء۔

[4] دیکھئے شیخ عمر بن محمد شہاب الدین سہروردی کی کتاب عوارف المعارف ۱/۳۵۔ مطبوعہ مصر۔

[5] التصوف الاسلامی ص۱۶

جزیرہ کے مسلمانوں میں رائج ہو گئے اور شام، مصر اور اندلس میں بھی پھیل گئے اور آخر میں یہ تصوف جب ایران پہونچا تو اس نے ایرانی رنگ و آہنگ اختیار کیا، ایران کے قدیم افکار کے سہارے اس کی تنظیم ہوئی اور مغرب میں نوافلاطونیت حتیٰ کہ اسرائیلیات نے بھی اس راہ کو اختیار کیا اور اس طرح تصوف کی تین شاخیں بن گئیں (۱) عراق کا تصوف نستوری، یعقوبی نصاریٰ اور صابئون ابن دیصان، اور ہرمس کی تعلیمات سے متاثر ہوا، (۲) ایران و ہند کا تصوف جو ایران کے زردشت اور مانی، ہندوستان کے بودھ اور اپنشد کی تعلیمات سے متاثر ہوا (۳) مصر و شام اور مغرب و اندلس کا تصوف جو نوافلاطونیت، یہود اور حکما اسکندریہ سے متاثر ہوا۔[1]

ہندوستان سے باہر تصوف کے جو مراکز و مساکن تھے وہاں اسلام سے پہلے دوسری قومی تہذیبیں اور نظریات موجود تھے۔ اس لیے تصوف پر بطور خاص ان کے اثرات پڑے اور جب یہ تصوف مختلف مرحلوں سے گذرتا ہوا ہندوستان آیا تو مسلمانوں میں مقبول عام ہو کر تہذیب اسلامی کا جزو بن گیا۔ شیخ محمد اکرام کہتے ہیں کہ خواجہ باقی باللہ کی آمد سے پہلے تصوف کے جو سلسلے ہندوستان میں برسر فروغ تھے وہ تمام کے تمام ایران اور عراق کی پیداوار تھے، مثلاً قادریہ سلسلہ کے بانی شیخ عبدالقادر جیلانی بغداد کے رہنے والے تھے۔ سہروردی سلسلہ بھی بغداد کے قریب سہرورد گاؤں سے شروع ہوا، چشتیہ سلسلہ بھی خراسان کی ایک بستی چشت کی طرف منسوب ہے۔ ان کے بقول "ان تینوں سلسلوں میں جزوی اور فروعی اختلافات تھے لیکن ان کا روحانی پس منظر ایک تھا، ان سب میں وہ عجمیت جو دور عباسیہ کو دور امویہ سے اور بغداد کے متکلموں اور فلسفیوں کو مدینہ منورہ کے فقہا، اور محدثین سے منفرد کرتی ہے موجود تھی، تینوں میں صلح کل کا طریقہ مقبول تھا جس کے تحت غیر مروجہ بلکہ غیر اسلامی طریقوں سے اخذ فیض کرنے میں اجتناب نہ کیا جاتا تھا، تینوں میں شرع کے مقابلے میں تھوڑی بہت آزادی تھی اور تینوں میں وحدت الوجود کا طریقہ رائج ہو گیا تھا"۔[2]

مولانا عبیداللہ سندھی تصوف کو اسلام کا ایک حصہ تسلیم کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ "ایرانی مسلمانوں کے پرانے فلسفہ نے عباسیوں کے دور میں رنگ جمانے کے بعد جب

---

[1] سرچشمہ تصوف در ایران ص۷۷۔

[2] محمد اکرام، رود کوثر ص۲۵۹۔

دوبارہ جنم لیا تو اس کا نام تصوف ہوا[1]۔ بلخ وبخارا اور خراسان میں بدھ مت ایک طاقتور مذہب کی حیثیت رکھتا تھا وہاں اس کے بڑے بڑے مراکز موجود تھے اور بدھ کے پیرو بڑی تعداد میں اپنے نظام کے استحکام میں مشغول تھے، جب وہاں تصوف یا صوفیاء کرام پہونچے تو بدھ مت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور بودھ طریقۂ حیات نے نظام تصوف کو نئی جہت عطا کی۔ چنانچہ تصوف کے بہت سے طریقے اور نظریے اسی بدھ مت کی پیداوار ہیں مثلاً حبسِ دم، صلحِ کل، تصور شیخ، مریدوں کا سر منڈانا وغیرہ[2]۔

تصوف کے نظریات

تصوف کے بعض نظریات تو قرآن وسنت پر مبنی ہیں مثلاً صبر، شکر، توکل، زہد، استغنا وغیرہ ان کی تفصیلات میں اختلاف تو ہوسکتا ہے مگر ان اصولوں سے نہیں۔ البتہ تصوف کے بعض نظریات اجنبی ہیں۔ تصوف کے ان نظریات میں بہت سی چیزیں قابلِ بحث ہوسکتی ہیں مگر ان میں سب سے زیادہ معروف اور نتائج کے اعتبار سے دوررس وحدت الوجود اتحاد اور حلول اور رجال الغیب کے نظریات ہیں جن کے اثرات آج بھی لوگوں کے دل و دماغ پر قائم ہیں۔ وحدت الوجود کا نظریہ، تصوف میں زیادہ معروف ہے اور ہندوستان میں شیخ احمد مہائمی، شیخ عبدالقدوس گنگوہی شیخ تاج العارفین وغیرہ جیسے سیکڑوں بزرگوں نے اس کی وکالت اور اشاعت کی ہے۔ ہندوستان میں چشتیہ اور قادریہ سلسلے بھی وجودی تصوف کے حامی نظر آتے ہیں۔ فیروز شاہ خلجی کے زمانہ میں، احمد بہاری اور شیخ عز کاکوی جو فردوسی سلسلہ سے تعلق رکھتے تھے نے وجودیت کے سلسلے میں خدائی تک کا دعویٰ کیا اور لوگ ان کے پیچھے ہو لیے چنانچہ علماء کو ان کے قتل کا فتویٰ دینا پڑا[3]۔

سوال یہ ہے کہ تصوف میں اس نظریہ کی آمد کہاں سے ہوئی؟ بعض حضرات نے خود قرآن کی اس آیت "ھو الاول والآخر والظاھر والباطن"[4] کو اس کا سرچشمہ قرار دیا ہے اور بعض

---

[1] شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ ص۲۰۳، لاہور ۱۹۴۴ء۔

[2] Aziz Ahmad. Studies in Islamic culture in the Indian Environment. P.126, 177, oxford. 1964

[3] فتوحات فیروز شاہی ص۶ [4] الحدید۔۳

حضرات نے اسے ہندو مت کے ویدانت سے ماخوذ بتایا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اسلامی دنیا میں اس نظریہ کی ابتدا تیسری صدی ہجری کے آخر یعنی حسین بن منصور حلاج کے زمانے سے ہوئی اور اس کو تقویت اور کمال ساتویں صدی ہجری یعنی محی الدین ابن عربی م ۶۳۸ھ کے عہد میں ملا۔ چنانچہ علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ "اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہندوستان میں آنے کے بعد ہندو ویدانتوں کے تخیل سے مسلمان صوفیوں پر اثر پڑا ہے۔ مگر اسلامی تصوف میں اس تخیل کا اثر بہت پہلے سے معلوم ہوتا ہے۔ خصوصاً جب یہ واقعہ ہے کہ مسلمانوں میں محی الدین ابن عربی ہی سب سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس عقیدہ کی سب سے پرجوش حمایت کی ہے اور وہ اسپین کے باشندے تھے اور کبھی ہندو فلسفہ سے ان کو دوچار ہونے کا موقع نہیں ملا اس لیے یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ ہندو ویدانت سے نہیں بلکہ نوافلاطونی فلسفہ سے متاثر ہوئے تھے"[1] نوافلاطونیت سے اس نظریہ کا متاثر ہونا بظاہر درست معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ یونانی فلسفہ کا اصول ہے کہ " لا یصدر عن الواحد الا الواحد" یعنی ایک چیز سے صرف ایک ہی چیز کا صدور ہو سکتا ہے۔ بہت سی چیزوں کا نہیں۔ اللہ چونکہ ذات واحد ہے اور مختلف مظاہر اور کائنات کا خالق بھی اللہ ہے، یہ اس اصول سے ٹکراتا ہے اس لیے کہ ایک ذات سے بہت سی چیزوں کا صدور لازم آتا ہے اس "تضاد" کو دور کرنے کے لیے وحدت الوجود کا سہارا لیا گیا جس کی رو سے تمام موجودات ذات واحد کے وجود کے ظہور کی عملی شکل ہے یا یہ کہ وجود حقیقی تو اللہ ہے باقی موجودات اس کا حصہ ہیں۔

اس نظریہ کا منطقی نتیجہ ایک دوسرا نظریہ ہے جسے "اتحاد اور حلول" کہا جاتا ہے یعنی جب ساری مخلوق ایک ہی وجود کا حصہ ہے تو بالآخر اسے اسی ذات میں لوٹ جانا ہے کیونکہ ہر چیز اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے۔ اتصال بالمبدا، فنا فی اللہ، محو و تجرید اور اتحاد اور حلول کے نظریات تمام صوفیہ کے یہاں کسی نہ کسی درجہ میں موجود ہیں۔ ابن خلدون کی نظر میں حلول کا نظریہ صوفیا نے شیعہ حضرات سے لیا ہے۔ ان کے بقول متاخرین صوفیہ چونکہ اسماعیلیوں سے بہت زیادہ ربط و ضبط رکھتے تھے اور اسماعیلی حلول اور الوہیت

---

[1] سید سلیمان ندوی، عرب و ہند کے تعلقات ص ۲۴۷-۲۴۸، اعظم گڑھ ۱۹۷۹ء۔

ائمہ کے قائل تھے اس لیے ابن عربی، ابن سبعین اور ان دونوں کے شاگرد، ابن العفیف، ابن الفارض، اور النجم اسرائیلی بھی اس کے متبع ہو گئے[1] بظاہر ایسا لگتا ہے کہ حلول کا نظریہ زرتشت اور بودھ کی تعلیمات سے ماخوذ ہے یہ ہو سکتا ہے کہ اسماعیلیوں نے بھی زرتشتی عقیدہ سے متاثر ہو کر اسے اپنایا ہو اور وہ صوفیا تک منتقل ہوئے ہوں۔ اتصال بالمبداء، فنا فی اللہ محو و تجرید اور اتحاد و حلول کے اس روحانی ارتقاء کا تذکرہ سب سے پہلے تفصیل کے ساتھ سنائی نے "سیر العباد الی المعاد" میں کیا ہے اس کے بعد عطار نے "منطق الطیر" میں کیا ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ روح چڑیا کی صورت میں سات وادی سے گذرتی ہے اور اس جگہ پہونچتی ہے جہاں اپنے مطلوب کمال کو حاصل کر لیتی ہے۔ دین زرتشت میں بھی سیر و سلوک اور طے مدارج کا بیان روحانی معراج میں ہے جو کہ "ارادی ویراف نامہ" مشہور داستان میں باقی ہے۔ یہی اصول بدھ مت کی تعلیمات میں "نروان" کے نام سے موسوم ہے جس کا نتیجہ فنا ہے[2] بدھ مت اور ویدانت وغیرہ کے اثرات کی بنا پر حلول کا عقیدہ غلو، وتقصیر یعنی یہ کہ انسان خدا کے درجہ تک پہونچ سکتا ہے اور خدا انسان کے درجہ تک اتر سکتا ہے کہ ہندوستان میں قبول کرنے کی بڑی صلاحیت موجود تھی اور شیعوں کے اس اثر نے ہند کے صوفیا کو اسی لیے متاثر کیا ہے[3]

وحدت الوجود کے بطن سے نمودار ہونے والا ایک نظریہ "صلح کل" بھی ہے جو بالآخر وحدت ادیان پر منتہی ہوتا ہے یعنی اگر یہ بات تسلیم کر لی گئی کہ سارے موجودات ایک ہی وجود کا حصہ ہیں، تو ان موجودات میں تمیز، دوئی اور اختلاف روا نہیں، سارے راستے جب ایک ہی منزل کو پہنچتے ہوں تو ان سب کو یکساں، اہمیت ملنی چاہیے جسے ارباب تصوف ؏ 'ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے' کا عنوان دیتے ہیں۔

تصوف میں ایک معروف تصور مردان غیب کا بھی ہے اس کے مطابق نظام عالم کی اس ظاہری ہیئت کے پس پردہ ایک باطنی نظام ہوتا ہے جس کے چلانے والے مختلف

---

[1] ابن خلدون، مقدمہ ص ۴۷۳ فصل تصوف، مکتبہ المثنیٰ بغداد۔

[2] دیکھئے سرچشمہ تصوف در ایران ص ۳۶-۳۵۔

[3] اسلامی تہذیب کا ہندوستانی سماج پر اثر ص ۷۷۔

مردانِ غیب ہوتے ہیں۔ ان میں قطب، قیوم، اوتاد، ابدال، مجذوب، نجبا، غوث وغیرہ ہوتے ہیں یہی حضرات دنیا کا نظام چلاتے ہیں اور یہی لوگ حسبِ مرتبہ اللہ کے امر کا نفاذ کرتے ہیں یا اپنا امر اللہ سے نافذ کراتے ہیں۔ بسا اوقات ان کے اختیارات اس قدر ہوتے ہیں کہ اللہ ان کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کرتا، ان کی مرضی اللہ کی مرضی ہوتی ہے اور ان کی ذات اللہ کا مظہر ہوتی ہے۔ قطب عارف کامل کی ترجمانی کرتا ہے۔ صوفیاء کا خیال ہے کہ معرفت میں کوئی شخص قطب کے درجہ تک نہیں پہونچ سکتا جب تک اللہ اسے موت نہ دے[1] جیلی نے انسان کامل کے بارے میں کہا ہے کہ "انسان کامل وہ قطب ہے جس پر اول سے آخر تک وجود کے افلاک گردش کرتے ہیں اور وہ ابتداء وجود سے لے کر ابدالآباد تک ایک ہے[2] اوتاد کی تشریح کے لیے حسب ذیل شعر کافی ہے:۔

اگر اوتاد نبود بر روئے زمین　　　نماند پایہ خیمہ ہفتمیں

(اگر روئے زمیں پر اوتاد نہ ہوتے تو ساتوں آسمان قائم نہ رہتے)

ابدال کے متعلق یہ واقعہ مشہور ہے کہ غوث الاعظم عبدالقادر جیلانیؒ کی خانقاہ کے دروازہ پر ایک شخص دست و پا شکستہ پڑا تھا اس کے متعلق دریافت کرنے پر حضرت غوثؒ نے فرمایا کہ اس شخص نے بے ادبی کی ہے، ابدالوں میں سے تھا کل اپنے دو رفیقوں کے ساتھ ہوا میں اڑتے ہوئے اس خانقاہ کے اوپر آیا ایک نے ادب سے داہنی جانب کنارہ کیا دوسرے نے بھی اس کی تقلید کی اور بائیں جانب چلا گیا۔ اس شخص نے بے ادبی سے سیدھا جانا چاہا۔ جب ہوا میں خانقاہ کے سامنے آیا تو گر پڑا اور ہاتھ پاؤں ٹوٹ گئے[3] غوث ان تمام کا حاکم ہوتا ہے۔ چنانچہ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ باتفاق تمام صوفیاء کرام غوث تسلیم کئے گئے ہیں۔ چنانچہ جب بھی غوثِ اعظم کہا جاتا ہے تو اس سے مراد حضرت شیخ ہی ہوتے ہیں۔ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ جن خصوصیات کی بناپر اس عظیم منصب کے مستحق ہوئے اس کی تفصیل شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے بیان

---

[1] ابن خلدون، مقدمہ ص۴۷۳۔

[2] الانسان الکامل ۲/۴۶ مطبوعہ مصر ۱۳۱۶ھ۔

[3] فوائد الفواد ص۲-۳، لاہور ۱۹۶۶ء۔

فرمائی ہے وہ کہتے ہیں کہ:

"آنحضرت (یعنی غوث اعظم) سے بہت سی کرامات منقول ہیں مخلوق کے ظواہر اور بواطن میں تصرف، جن و انس پر حکم جاری کرنا، ضمیروں کے راز سے باخبر ہونا، بھیدوں کا بتا دینا، اور ملک و ملکوت کی خفیہ باتوں کی اطلاع دینا، حقائق جبروت اور اسرار لاہوت کو منکشف کرنا، مواہب غیبیہ عطا کرنا اور حوادث و دواہی کی تقلیب و تصریف، اور تصریف اکوان بمجرد اثبات الٰہی، مارنے اور جلانے کی صفت سے متصف ہونا، پودے اگانا، کوڑھی اور جذامی کو اچھا کرنا مریضوں کو شفا دینا، زمین و آسمان میں حکم چلانا" وغیرہ[1]۔ خود حضرت غوث نے مرض موت میں فرمایا، میرے اور تمہارے، میرے اور تمام مخلوق کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے مجھ کو کسی پر اور کسی کو مجھ پر قیاس مت کرنا میں مخلوق کے امور کا مالک ہوں، میں ان کی عقلوں کا مالک ہوں، اے مشرق و مغرب کے اور اے آسمان کے باشندو! اللہ نے فرمایا ہے" اعلم مالا تعلمون" میں انہی میں ہوں جسے خدا جانتا ہے تم نہیں جانتے ہو۔[2]"

ہندوستان میں مجددی تصوف میں چار بزرگوں کی قیومیت تسلیم کی گئی ہے، قیوم اول شیخ احمد سرہندی قیوم ثانی خواجہ محمد معصوم قیوم ثالث خواجہ محمد نقشبند قیوم رابع خواجہ محمد زبیر مگر قیوم کیا چیز ہے اس کی تفصیل روضۃ قیومیہ میں اس طرح مذکور ہے کہ قیوم اس شخص کو کہتے ہیں جس کے ماتحت تمام اسماء و صفات شیونات و اعتبارات اور اصول ہوں، تمام گذشتہ اور آئندہ مخلوقات کے لیے عالم موجودات وحوش پرند، نباتات، ذی روح، پتھر درخت بحر و بر کی ہر شے، عرش و کرسی، لوح و قلم، ستارے، ثوابت، سورج، چاند، آسمان، بروج سب اس کے سایہ میں ہوں افلاک و بروج کی حرکت و سکون، سمندروں کی لہروں کی حرکت، درختوں کے پتوں کا ہلنا بارش کے قطروں کا گرنا، پھلوں کا پکنا، پرندوں کا چوں چوں پھیلانا، دن رات کا پیدا ہونا اور گردش کرنے والے آسمان کی موافق رفتار سب کچھ اسی کے حکم سے ہوتا ہے۔ بارش کا ایک قطرہ ایسا نہیں جو اس کی اطلاع کے بغیر گرتا ہو۔ زمین پر حرکت و سکون اس کی مرضی کے بغیر نہیں جو آرام، خوشی اور بے چینی اور رنج اہل زمین کو ہوتا ہے اس کے حکم کے بغیر نہیں ہوتا۔ کوئی گھڑی کوئی دن کوئی ہفتہ کوئی

---

[1] عبدالحق محدث دہلوی، اخبار الاخیار ص۲۳-۲۲ کتب خانہ رحیمیہ دیوبند۔ [2] ایضاً ص۱۶
۴۴۳

مہینہ کوئی سال ایسا نہیں جو اس کے حکم کے بغیر اپنے آپ میں نیکی و بدی کا تصرف کرسکے۔ غلہ کی پیدائش نباتات کا اگنا غرض جو کچھ بھی خیال میں آسکتا ہے وہ اس کی مرضی اور حکم کے بغیر ظہور میں نہیں آیا۔ روئے زمین پر جس قدر عابد و زاہد، امرا اور مقرب، تسبیح، ذکر و فکر، تقدیس اور تنزیہ میں عبادت گاہوں جھونپڑوں، کٹیوں، پہاڑوں، اور دریا کے کنارے، زبان، قلب، روح، سر خفی، خفی اور نفسی مشاغل اور معتکف ہیں اور اللہ کی راہ میں مشغول ہیں۔ گو انھیں اس بات کا علم نہ ہو جب تک ان کی عبادت قیوم کے یہاں مقبول نہ ہو، اللہ کے یہاں مقبول نہیں ہوتی۔[1]

خواجہ نظام الدین اولیاء سے منقول ہے کہ "جب ولی مقام قطبیت اور غوثیت اور فردیت کو طے کر کے مرتبہ محبوبیت کو پہونچتا ہے تو اس کی ذات مظہر الٰہی ہو جاتی ہے اور اس کا ارادہ بھی ارادۃ اللہ ہو جاتا ہے۔"[2] واضح رہے کہ حضرت نظام الدین اولیاء کا لقب محبوب الٰہی ہے اس کی رو سے وہ اس مقام پر فائز ہیں۔

تصوف پر تشیع کا اثر

اگر غور سے دیکھا جائے تو تصوف کے یہ نظریے عقیدہ توحید اور اس کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں معلوم ہوتے مگر صوفیاء نے اہلِ تشیع کے زیرِ اثر ان کو نہ صرف قبول کیا بلکہ اپنے نظام میں نمایاں حیثیت دے دی۔ تصوف اور تشیع دونوں کا شجرہ حضرت علیؓ پر منتہی ہوتا ہے۔ ہر دو جگہ حضرت علیؓ کو مرکزی ستون کی حیثیت حاصل ہے۔ اگر ایک طرف اہلِ تشیع اس اعتقاد پر قائم ہیں کہ حضرت علی اللہ کے ولی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی اور ان کے بعد خلیفہ بلافصل ہیں تو دوسری طرف اہلِ تصوف اس عقیدہ کے حامل ہیں کہ دوسرے صحابہ کے مقابلہ میں یہ صرف علیؓ کی ذات گرامی ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات باطنی کی حامل ہے۔ جن کو نبیؐ نے بطورِ خاص خرقۂ تصوف سے نوازا تھا۔ چنانچہ میر خورد نے لکھا ہے کہ "حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شبِ معراج میں اللہ کی جانب سے جو خرقۂ فقر کی

---

[1] روضۂ قیومیہ ص۹۴ اردو ترجمہ مولانا کمال الدین محمد احسان، مطبوعہ لاہور۔

[2] سیرت نظامی ص۱۴۲، بحوالہ آب کوثر ص۲۷۷۔

خلعت عطا ہوئی تھی آپ نے خلفا اربعہ میں سے حضرت علیؓ کو اس سے مشرف کیا اور قیامت تک کے لیے یہ سنت مشائخ میں ان کی وجہ سے قائم ہوئی[1] جنید بغدادیؒ کا مشہور قول ہے " شیخنا فی الاصول والبداء علی المرتضٰی"[2] اور یہ اس وجہ سے ہے کہ صوفیا کے یہاں محمدؐ اور علیؓ حقیقت کاملہ کے ہی دو روپ ہیں چنانچہ مشہور عارف محمود بن علی کاشانی ۷۳۵ھ فرماتے ہیں کہ:-

گہ نبی بود و گرگاہے ولی — گہ محمد گشت و گاہے شد علی
در نبی آدم بیان راہ کرد — در ولی از سرِ حق آگاہ کرد[3]

(کبھی نبی ہوتا ہے اور کبھی ولی، کبھی محمد ہوتا ہے اور کبھی علی، نبی آدم کی رہنمائی کرتا ہے اور ولی کو رازِ حق سے آگاہ کرتا ہے۔ یہ تصور بھی اہل تشیع کی دین ہے۔ مزید برآں حضرت علیؓ کے فضائل کی جو روایات صوفیاء میں معروف ان میں سے بیشتر اہل تشیع کی اختراع ہیں۔

خضر تصوف میں

رجال غیب کے ضمن میں حضرت خضر کا مقام بھی ممتاز اہمیت کا حامل ہے۔ محدثین کی صراحت کے مطابق خضر وفات پا چکے مگر صوفیاء کے لیے وہ نہ صرف زندہ ہیں بلکہ خاص صوفیاء کی ان سے ملاقات بھی ہوتی ہے[4] اور وہ خرقہ تصوف بھی پہنایا کرتے ہیں۔ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی نے بھی خرقہ طریقت حضرت خضر سے پہنا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ میں خرقہ پوشی کا صوفیاء کی طرح قائل نہ تھا تا وقتیکہ بیت اللہ میں خضرؑ کے ہاتھ سے خود نہ پہن لیا[5] بلکہ بعض بزرگ تو ایسے ہیں ہیں جن کے متعلق کیا جاتا ہے کہ ان سے خضر سلامتی ایمان کی دعا کراتے ہیں[6]

۱؎ سید محمد بن مبارک علوی (میر خورد) سیر الاولیاء ص ۱۸، لاہور ۱۹۷۸ء: نیز دیکھئے فوائد الفواد ص ۳۲۹

۲؎ سیر الاولیاء ص ۱۹ ۳؎ ڈاکٹر محسن جہانگیری، محی الدین ابن عربی، حیات و آثار ص ۶۹، اردو ترجمہ احمد جاوید و سہیل عمر، لاہور ۱۹۸۹ء ۴؎ حمید قلندر، خیر المجالس ص ۴۷، شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۵۹ء۔

۵؎ محی الدین ابن عربی ص ۶۹۔

۶؎ خیر المجالس ص ۱۴-۱۳۔

مراسم تصوف

تصوف میں کچھ رسمیں عبادات سے متعلق ہیں اور کچھ نظام تصوف سے۔ عبادات سے متعلق جو چیزیں حلقہ صوفیا میں معروف ہیں وہ سب کی سب قرآن وسنت پر مبنی نہیں ہیں بلکہ ان میں سے بعض حضرات صوفیا کی ایجادات میں سے ہیں۔ مثلاً نماز خضر، نماز اویس قرنی، نماز معکوس، نماز فقرا، نماز لیلۃ الرغائب، نماز درازیٔ عمر، نماز طلوع وغروب وغیرہ ان نمازوں کی تفصیل فوائد الفواد، سیر الاولیا اور دیگر کتب تصوف میں موجود ہیں[1] نیز ان نمازوں کا استحباب ثابت کرنے کے لیے صوفیا میں موضوع روایات کا بھی چلن عام رہا ہے[2]۔ یہاں ان مراسم کا تذکرہ مناسب ہے جو نظام تصوف کو متعارف کراتے ہیں۔ ان میں پیر، مرید اور بیعت کے مراسم زیادہ اہم ہیں۔ پیر کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ پیغمبر کے قائم مقام ہوتا ہے جیسا کہ مشہور ہے کہ الشیخ فی قومہ کالنبی فی امتہ[3]۔ شیخ کا مقام اپنی قوم میں اسی طرح ہے جس طرح نبی کا مقام اپنی امت میں۔ بغیر نبوت کے ایمان کا اعتبار نہیں بغیر شیخ کے ہدایت کا تصور نہیں۔ چنانچہ ابو یزید بسطامی کا مشہور قول ہے جو بعض اوقات حدیث کی حیثیت سے بھی پیش کیا گیا ہے "من لیس لہٗ شیخ فشیخہ ابلیس[4]۔ جس کا کوئی شیخ نہ ہو اس کا شیخ ابلیس ہوتا ہے۔ صرف شیخ ہی کی رہنمائی انسان کو منزل مقصود تک پہونچا سکتی ہے اسی لیے کہا گیا ہے کہ مرید کے دل میں پیر کی محبت اور اعتقاد اس حد تک ہونا چاہیے کہ وہ یہ سمجھے کہ اس زمانہ میں اس کے علاوہ اور کوئی اسے خدا تک نہیں پہونچا سکتا، اگر کمزور اعتقاد مرید کے دل میں یہ خیال آجائے کہ پیر کے علاوہ بھی کوئی خدا تک پہونچا سکتا ہے تو یقینی طور پر شیطان نے اس کے اعتقاد میں خلل اندازی کی ہے[5]۔ اسی لیے شیخ کا ہر حکم ماننا خواہ وہ خلاف شرع ہی کیوں نہ نظر آئے ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ حافظ کا مشہور شعر ہے:۔

---

[1] فوائد الفواد ص ۳۴، ص ۲۲۷، سیر الاولیا، ص ۳۹۸

[2] اللآلی المصنوعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ ص ۷۔ [3] سیر الاولیا ص ۳۷

[4] خیر المجالس ص ۴۸، نیز دیکھئے فوائد الفواد ص ۲۹۲۔

[5] سیر الاولیا، ص ۳۴۵۔

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید کہ سالک بے خبر نبود زراہ ورسم منزلہا

(اگر پیر مغاں کہے تو سجادہ کو شراب سے رنگین کر دو، کیوں کہ سالک منزل کی رسم وراہ سے بے خبر نہیں ہوتا)
مریدسے اسی اعتقاد ہمہ اوست کا امتحان لینے کے لیے بسا اوقات پیر اس سے اپنے کو رسول کہلواتا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت شبلی کی خدمت میں ایک شخص مرید ہونے کے لیے حاضر ہوا، شیخ نے فرمایا میں ایک شرط پر تجھکو مرید کرتا ہوں کہ میں جو کہوں تو اسے بجالائے، اس نے قبول کیا۔ شیخ نے فرمایا کلمہ کس طرح پڑھتے ہو؟ اس نے کہا "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" شیخ نے فرمایا اس طرح پڑھو "لا الٰہ الا اللہ شبلی رسول اللہ" وہ شخص راسخ العقیدہ تھا فوراً پڑھنے لگا۔ اس پر شبلی نے کہا کہ صرف تیری عقیدت کو جانچنے کے لیے کہا تھا ورنہ میں تو رسول اللہ کے کمترین غلاموں میں سے ہوں[1] خواجہ معین الدین چشتیؒ کے بارے میں بھی منقول ہے کہ انھوں نے ایک نووارد کا امتحان لینے کے لیے "لا الٰہ الا اللہ چشتی رسول اللہ" کہلوا کر بیعت کیا تھا۔[2] ذوالنون مصری کا قول ہے کہ :-

ہرگز مرید نہ بود تا استاذ خود را فرمان بردہ تر نبود از خدائی۔[3]

کوئی شخص ہرگز مرید نہیں ہو سکتا جب تک خدا سے زیادہ اپنے استاذ (پیر) کا فرماں بردار نہ ہو جائے۔

سجدۂ تعظیمی

پیر کا یہی وہ بلند و برتر مقام ہوتا ہے جس کی وجہ سے صوفیاء نے اپنے لیے سجدہ تعظیمی کو روا رکھا ہے، چنانچہ نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا "بہت سے آدمی میرے پاس آتے ہیں اور سجدہ تعظیم کرتے ہیں، زمین پر سر رکھتے ہیں۔ یہ امر شیخ الاسلام فرید الدین اور حضرت بختیار کاکیؒ کے سامنے بھی ہوتا تھا اور آپ اس کو روا رکھتے تھے پس میں بھی کچھ نہیں کہتا، اس وقت فوائد الفواد کے مرتب امیر حسن علا سنجری نے عرض کیا جو شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور بغایت تعظیم سے سر زمین پر رکھتا ہے اس میں اس کو مزید حاصل ہوتا ہے کہ نفس اس کا ٹوٹتا ہے۔ کیونکہ مخدوم کو اللہ نے یہ شرف بخشا ہے کہ جس طرح اللہ کی عظمت

---

[1] فوائد الفواد ص۳۹۲ [2] فوائد السالکین ص۲۳ ، اردو ترجمہ، مکتبہ جام نور، نئی دہلی
[3] فرید الدین عطار، تذکرۃ الاولیاء ۱/۱۳۱ مطبع بریل لیڈن ۱۹۰۵ء۔

اور جلال بلند ہے، اور حق بجا آوری، احسانات و شکرگذاری ادا نہیں ہوسکتی اسی طرح آپ کی تعظیم بھی کامل نہیں ہوسکتی[1] بلکہ بعض صوفیا، نے تو بادشاہوں کو سجدہ تعظیمی کا مستحق بنا دیا ہے۔ بادشاہ اکبر کو دین سے بیزار کرنے میں صوفیا، نے جو کردار ادا کیا بدایونی نے تفصیل سے اس پر گفتگو کی ہے بدایونی تاج الدین ولد زکریا اجودھنی جو کئی کتابوں کے مصنف تھے، ممتاز صوفی تھے اور تاج العارفین کہلاتے تھے کے متعلق کہتا ہے کہ انھوں نے خلیفۃ الزماں کو انسان کامل کہا اور اکبر کو اس لقب کا مستحق قرار دیا اور اس کے لیے سجدہ تجویز کیا جس کا نام زمین بوس رکھا اس کی تائید میں بعض روایات اور ان ہندوستانی صوفیانہ طریقوں کی مثال دی جن میں مرید اپنے مرشدوں کو سجدہ تعظیمی کرتے ہیں[2]۔

پیر کی دستگیری بعد وفات

پیر کی رہنمائی اور کاملیت کے پیش نظر اس کی وفات کے بعد بھی اس کے کپڑوں سے تجدید بیعت کی جاتی ہے۔ چنانچہ نظام الدین اولیا، سے منقول ہے کہ "اگر مرید تجدید بیعت کرنا چاہے اور شیخ موجود نہ ہو تو جامہائے شیخ اپنے سامنے رکھے اور ان سے بیعت کرے۔ حضرت شیخ الاسلام بسا اوقات ایسا ہی کرتے تھے اور میں بھی ایسا ہی کرتا ہوں[3]۔"

پیر اپنی زندگی میں ہی مرید کا رہنما فیض رساں اور دستگیر نہیں ہوتا بلکہ مرنے کے بعد بھی اسے فیض پہونچاتا ہے اور تصرفات پر قدرت رکھتا ہے، چنانچہ مشہور ہے کہ خواجہ عثمان ہارونی کے ایک مرید کا جب انتقال ہوگیا اور فرشتوں نے اسے عذاب دینا چاہا تو شیخ مانع ہوئے فرشتوں نے خدا کے حکم سے کہا یہ آپ کے راستے سے ہٹا ہوا تھا، شیخ نے کہا یہ درست ہے لیکن تھا تو میرا مرید چنانچہ فرشتوں کو حکم ہوا کہ شیخ کے مرید سے تعرض نہ کریں[4]۔ اسی لیے مرید شیخ کے نام کی قسمیں کھاتا ہے اور اس کے نام کا ورد کرتا ہے چنانچہ شیخ نظام الدین اولیا، شروع میں ہر نماز کے بعد دس بار شیخ فرید اور دس بار مولانا فرید کہتے تھے اور ان کے نام کی قسم کھاتے تھے[5]۔

---

[1] فوائد الفواد ص ۲۶۹، ص ۲۶۸   [2] عبدالقادر بدایونی منتخب التواریخ ۲/۲۵۸ - کلکتہ ۱۸۶۹ء

[3] فوائد الفواد ص ۹۹   [4] سیر الاولیا ص ۵۵   [5] فوائد الفواد ص ۲۵۳

قبر پرستی

شاید اسی بنا پر شیخ کی قبر کی زیارت کرنا، شیخ کے واسطہ سے دعا مانگنا اہل تصوف میں بہت رائج رہا ہے، چنانچہ شاہی موئے تاب اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میری وفات کے بعد جس شخص کو کوئی مشکل آئے اس کو لازم ہے کہ مسلسل تین دن تک میری زیارت کو آئے انشاء اللہ اس کی مراد پوری ہوگی اگر نہ ہو تو چوتھے دن پھر آئے، ضرور حاجت پوری ہوگی اگر بالفرض پوری نہ ہو تو پانچویں روز آ کر میری قبر کی اینٹ سے اینٹ بجا دے[1]۔ اسی طرح شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا جب بھی اللہ سے کوئی چیز مانگو تو میرے وسیلہ سے مانگو، تاکہ مراد پوری ہو، جو کسی مصیبت میں میرے وسیلہ سے امداد چاہے تو اس کی مصیبت دور ہو جو کسی سختی میں میرا نام لے کر پکارے اسے کشادگی حاصل ہو[2]۔ مزید فرمایا کہ میں قیامت تک اپنے مریدوں کی دستگیری کرتا رہوں گا اگرچہ وہ سواری کرے[3]۔ شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے بارے میں گلزار ابرار کے مصنف لکھتے ہیں کہ جب بادشاہ وقت نے ان کو دہلی سے ہٹ جانے پر مجبور کر دیا تو وہ نارنول پہنچے اور شیخ محمد ترک نارنولی کے روضہ پر آئے اور شیخ محمد کی قبر کی طرف منہ کر کے مراقب ہوئے۔ جب سر اٹھایا تو فرمایا جس کسی کو دشواری پیش آئے اس کو چاہیے کہ وہ جبین نیاز ان حضرت کی خاک پر رگڑے اور اپنی مشکل کی آسانی چاہے[4]۔ شیخ نظام الدین اولیاء کہتے ہیں کہ "مجھے جو ضرورت پیش آتی ہے اسے والدہ کی قبر کے سامنے پیش کرتا ہوں اکثر ایک ہفتہ میں ضرورت پوری ہو جاتی ہے، ایسا کم ہوتا ہے کہ ایک مہینہ لگ جائے[5]۔

شیخ کی انہی خدائی صفات کی بنا پر صوفیا اکرام حج بیت اللہ پر شیخ کی قبروں کی زیارت کو ترجیح دیتے تھے۔ فوائد الفواد کے مرتب امیر حسن علا سجزی نے شیخ نظام الدین اولیاء کے سامنے اپنے دوست ملیح کا یہ جملہ نقل کیا کہ حج کو وہ شخص جائے جس کا کوئی پیر نہ ہو۔ اس کے جواب میں شیخ نے فرمایا ع آں رہ بسوی کعبہ بردو ایں بسوی دوست[6]

---

[1] ایضاً ص۱۵۹ [2] اخبار الاخیار ص۲۶-۲۵ [3] ایضاً ص۲۵ [4] محمد غوثی شطاری، گلزار ابرار، اردو ترجمہ فضل احمد جیوری ص۶۹، لاہور ۱۳۹۵ھ [5] فوائد الفواد ص۱۱۲ [6] فوائد الفواد ص۲۶۳

مزید فرمایا کہ شیخ فریدالدین کے انتقال کے بعد مجھ کو ادائے حج کا اشتیاق بہت ہوا، میں نے اپنے دل میں ارادہ کیا کہ اجودھن سے واپس آکر حج کو جاؤں گا الغرض اجودھن سے حضرت شیخ الاسلام کے مزار کی زیارت کو گیا وہاں مجھے میرا مقصود شی زائد کے ساتھ مل گیا، اس کے بعد پھر ایک مرتبہ خانہ کعبہ کی زیارت کی نیت ہوئی اس مرتبہ بھی اجودھن حضرت شیخ کے روضہ مبارکہ کی زیارت کو گیا اور غرض مذکور مجھ کو حاصل ہو گیا[1] ہندی مسلمانوں پر اس تصوف کا یہ اثر مرتب ہوا کہ مسجد کے بجائے مزارات اور آستانے زیارت گاہ بن گئے، عوام بالخصوص جاہل طبقہ ان قبروں کو حاجت روائی کا مرکز اور ان کے مکینوں کو حاجت روا مشکل کشا سمجھنے لگا وہاں کی حاضری عبادت سے زیادہ اہم قرار پائی، اولاد کی طلب، نوکری کی غرض، کشائش رزق کی ضرورت اور دنیوی مرادوں کی تکمیل کے لیے قبروں کی زیارت اور ان پر نیاز چڑھانے اور وہاں سر جھکانے کی وبا عام ہو گئی اس کے لیے مزارات پختہ اور مزین ہونے لگے اور ایک ایسا کلچر وجود میں آگیا جسے مزاری کلچر کا نام دیا جا سکتا ہے اور یہی کلچر ہند و پاک بنگلہ دیش اور ترک و ایران کے جاہل عوام کا آئینۂ حیات ہے۔

طریقت اور شریعت

اسلام میں ظاہر و باطن اور شریعت و طریقت کی کوئی تقسیم نہیں۔ اسلام کے نظامِ تربیت میں نفس کا تزکیہ اور شرعی احکام کی پابندی ایک ہی حقیقت کے پہلو ہیں۔ قرآن و حدیث کی تعلیمات میں دونوں پر یکساں زور دیا گیا ہے اور کہیں بھی اس قسم کی تفریق ظاہر و باطن میں نہیں کی گئی، بلکہ ایک مومن کامل بموجب فرمان رسولؐ رات کا راہب اور دن کا مجاہد ہوتا ہے[2]۔ مگر صوفیاء کرام نے طریقت کے نام پر دین کی ایسی آبجو نکالی جو شریعت سے الگ اور متبادل سی چیز بن گئی اور ممتاز حیثیت کی حامل قرار پائی طریقت نے اپنے بال و پر اس طرح پھیلائے کہ شرعی احکام سے بے نیازی عام ہو گئی بلکہ اسے "اہلِ ظاہر" کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ ایسی مثالیں بھی اہلِ تصوف میں مل جاتی ہیں کہ

۱؎ ایضاً ۲؎ مسلم

دینی فرائض کو جن کا ترک کرنا کفر قرار دیا گیا ہے انجام نہیں دیتے۔ چنانچہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے ایک شریک مجلس نے پوچھا کہ بعض اولیا، کو اللہ کے ساتھ اتنی مشغولیت ہوگئی کہ وہ نماز بھی نہ ادا کر سکے، اس کے جواب میں شیخ نے فرمایا یہ حضرات مقتدا نہیں ہیں۔ اقتدا کے لیے شریعت کی رعایت واجب ہے[1]، اہلِ طریقت نے شریعت کے ان مظاہر کو بھی نشانہ بنایا جو اسلام کے تعارف کا ذریعہ ہیں، چنانچہ امیر خسروؒ، عرفی شیرازی اور شاہ ہمدانی کے بعض اشعار سے اس کا ثبوت ملتا ہے[2] شیخ احمد سرہندی نے ایک مکتوب کے جواب میں لکھا تھا" آپ نے تمہیدات عین القضاۃ (ہمدانی) کی عبارت کے معنی پوچھے ہیں اس میں لکھا ہے کہ تم جس کو خدا جانتے ہو وہ ہمارے نزدیک محمد ہے اور جس کو تم محمد جانتے ہو وہ ہمارے نزدیک خدا ہے۔ میرے مخدوم! اس قسم کی عبارتیں جو توحید والحاد کی خبر دیتی ہیں سکر کے غلبوں میں جو مرتبہ جمع ہے اور جسے کفر طریقت سے تعبیر کرتے ہیں مشائخ سے بہت صادر ہوتی ہیں۔ اس وقت دوئی اور تمیز ان کی نظر سے دور ہو جاتی ہے[3] سترہویں صدی میں ایک بزرگ حاجی لگن شوربانی قصوری نے سات حج کیے انشراح قلب کے لیے مختلف اولیاء کے پاس پہونچے مگر میسر نہ ہوا ساتویں حج میں اشارہ ہوا کہ تمہاری مشکلات کا حل شیخ عیسیٰ مشواتی کے پاس ہے۔ وہ ملامتیہ طریقہ سے وابستہ تھے اکثر شراب کے نشہ میں رہتے۔ حاجی لگن نے ان کا طریقہ اختیار کر لیا زہد و تقویٰ اور شریعت کی پابندی کو خیر باد کہدیا چار آبرو کا صفایا کیا اور ہر وقت آگ روشن رکھنے لگے، لباس میں صرف ستر عورت پر اکتفا کرتے

نقشبندیہ سلسلہ میں شریعت کو طریقت پر فوقیت دی گئی اور کشف و الہام وجد و حال کو

---

[1] خیر المجالس ص ۲۶

[2] امیر خسرو کہتے ہیں۔ کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست ہر رگ ما تار گشتہ حاجت زنار نیست

عرفی کہتے ہیں۔ چناں با نیک و بد عرفی بسر کن کز پس مردن مسلمانت بزمزم شوید و ہندو بسوزاند

ملا شاہ قادری کہتے ہیں۔ پنجہ در پنجہ خدا دارم من چہ پروائے مصطفےٰ دارم

شیخ سرہندی نے کہا تھا۔ اے دریغا کیں شریعت ملت آبائی است ملت ما کافری و ملت ترسائی است

کفر و ایماں ہر دو زلف و روئے آں زیبائی است کفر و ایماں ہر دو اندر راہ ما یکتائی است

[3] مکتوبات امام ربانی۔

کتاب وسنت کی کسوٹی پر رکھنے کا رجحان پیدا کرنے کی کوشش کی گئی[۱] تاہم عجمی تصوف کے مجموعی اثرات سے اس سلسلہ کو بھی متاثر ہونا پڑا اور اس کی مثال نظریہ قیومیت ہے۔

سوال یہ ہے کہ طریقت کی راہ اختیار کرنے والوں میں شریعت سے گریز کا رجحان کیونکر پیدا ہوا؟ اصل بات یہ ہے کہ ہندوستانی تصوف جو ایرانی اور عراقی تصوف کا شرمندۂ احسان ہے، اس سلسلہ میں بھی ایرانی تصوف کا پابند ہے، ایرانی تصوف کی اپنی کچھ خصوصیات ہیں جن میں ایک نمایاں وصف یہ ہے کہ ابتدائی عہد میں صرف طریقت ہی تصوف کا طریقہ عمل تھا، وہاں شریعت اور احکام سے تعرض نہیں ملتا۔ چنانچہ صوفیاء ایران نے ابتداء میں تصوف پر جو کتابیں لکھی ہیں ان میں فرائض اور عبادات اور شریعت کے معروف مباحث شامل نہیں ہیں ان کتابوں کے ابواب اور فصول سے معلوم ہوجاتا ہے کہ ان حضرات نے پانچویں صدی ہجری تک تصوف میں طریقت کے ساتھ شریعت کو نہیں جوڑا تھا، ان کی نظر میں شریعت اور طریقت دو مختلف چیزیں تھیں[۲]

اس اتحاد واتصال کے باوجود صوفیاء حضرات کے یہاں طریقت کچھ زیادہ اہمیت کی حامل رہی اور ارباب طریقت اپنے آپ کو اہل شریعت کے مقابلہ میں امتیاز وفضیلت کے حق دار سمجھتے رہے۔ بلکہ اس باب میں وہ ائمہ امت اور اساطین فقہ کو بھی فروتر گردانتے ہیں چنانچہ بعض صوفیاء برملا کہتے ہیں کہ

بوحنیفہ زعشق درس نگفت — شافعی را درو حکایت نیست
حنبل از عشق نیز بے خبر است — مالکے را در روایت نیست

امام ابوحنیفہ نے عشق کا درس نہیں دیا، امام شافعی کی عشق کے باب میں کوئی حکایت

۱؎ دیکھئے مکتوبات امام ربانی دفتر اول خط بنام مرزا حسام الدین۔

۲؎ تفصیل کے لیے دیکھئے سرچشمہ تصوف در ایران، باب طریقت وشریعت، مصنف نے ابونصر عبداللہ طوسی م ۳۷۸ھ کی کتاب اللمع، ابوبکر محمد بن اسحاق بخاری، ۳۸۰ھ کی کتاب التعرف لمذہب اہل التصوف ابوالحسن علی بن عثمان ہجویری، ۴۶۴ھ کی کشف المحجوب۔ ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن ۴۶۵ھ کی رسالۃ القشیریہ اور خواجہ عبداللہ انصاری م ۴۸۱ھ کی منازل السائرین اور صد میدان کے ابواب وفصول کو بطور مثال پیش کیا ہے۔ مصنف سعید نفیسی کا یہ بھی کہنا ہے کہ امام غزالی م ۵۰۵ھ پہلے شخص ہیں جنھوں نے شریعت اور طریقت کو جمع کیا ہے۔ یہی خیال ابن خلدون کا بھی ہے۔ دیکھئے مقدمہ ص ۴۶۹۔

نہیں ہے، امام احمد بن حنبل عشق سے بے خبر ہیں امام مالک کی اس سے متعلق کوئی روایت نہیں ہے۔

اصلاح معاشرہ اور تصوف

نظام تصوف میں تزکیہ نفوس اور اصلاح احوال کا مخصوص مقام ہے اور کہنا چاہیے کہ موثر طریقہ کار یہ ہے کہ جو شخص اپنی اصلاح کے لیے فکر مند ہے وہ کسی اہل دل کے ہاتھ پر بیعت کرے یا کسی خانقاہ کی حاضری اور اہل طریقت پر اعتقاد کو لازم پکڑ لے، اس طرح کہ وہ اپنی کمزوریاں شیخ کے سامنے پیش کرتا رہے اور ان کی اصلاح ہوتی رہے۔ رہا عوام کا وہ بڑا طبقہ جو دین کی تعلیم سے محروم دینی عمل سے غافل اور منکرات کا اسیر ہے اور اس کی توجہ بھی اصلاح طلبی کی طرف نہیں تو تصوف میں اس کی اصلاح کی ضرورت نہیں محسوس کی جاتی، یہ علماء اور واعظین کا تو کام ہو سکتا ہے جو اپنی تقریر، وعظ اور تبلیغ کے ذریعہ اس کام کو انجام دیتے ہیں مگر صوفیاء اسے اپنے دائرہ کار سے خارج سمجھتے ہیں، صوفیاء اس شخص یا اس گروہ کی اصلاح کے ذمہ دار تھے جو ان کے ساتھ اعتقاد رکھتا ہو اور اپنی اصلاح کے لیے اس حد تک فکر مند ہو کہ ان کی خانقاہ تک آنے کے لیے تیار ہو، دوسرے لوگ خواہ وہ منکرات اور مفاسد میں کہیں تک بھی گرفتار ہوں بہر حال ان کی اصلاح کی ذمہ داری ان پر عائد نہیں ہوتی چنانچہ شیخ کلیم اللہ دہلوی نے اپنے خلیفہ اعظم شیخ نظام الدین اولیاء اورنگ آبادی کو تحریر فرمایا کہ "صلح با ہندو و مسلمان سازند ہر کہ ازیں دو فرقہ کہ اعتقاد بشما داشتہ باشد ذکر و فکر و مراقبہ و تعلیم او رابگویند کہ ذکر بخاصیت خود او را براہ اسلام خواہد کشید و با غیر معتقد اگرچہ سید زادہ باشد تعلیم نہ باید کرد"[1] اس نقطہ نظر کو اختیار کر لینے کے بعد سماج کی معمولی اصلاح میں عملی حصہ لینا ایک غیر متعلق سی بات تھی۔ ڈاکٹر محمد اشرف کا کہنا ہے کہ "عام طور پر صوفیا کا عوام کے ساتھ تعلق اتنا ہی تھا کہ عوامی زندگی اور ان کی روحانی ضروریات سے ان کا رشتہ کم و بیش بے تعلق معلوم ہوتا ہے۔ وہ مسلمانوں کی تقلید پسندی کی زندگی سے غیر مطمئن تھے لیکن ان علماء کی طاقت کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتے

---

[1] مکتوبات کلیم اللہ ص ۸۶

تھے جو عوام کی رہنمائی کرتے تھے اور اسلامی عقائد کی بے لوث ترجمانی کا سہارا لے رہے تھے، اس طرح وہ مسلم امراکی زندگی کو بھی ناپسند کرتے تھے لیکن وہ برسر اقتدار طبقہ کی طاقت سے اس حد تک خوفزدہ تھے کہ نہ ان سے شدید اختلاف کرسکتے تھے اور نہ ان پر ایمان دارانہ تنقید کرسکتے تھے[1]

تیرہویں اور چودھویں صدی عیسوی ہندوستان میں تصوف کا عہد زریں شمار کیا جاتا ہے ان دو صدیوں میں بیشمار صوفیا اور مشائخ گذرے ہیں۔ خواجہ معین الدین چشتی سے لے کر نظام الدین اولیاءؒ اور نصیر الدین چراغ دہلی تمام اجلہ صوفیا، انہی صدیوں میں رونق افروز تھے۔ مگر ان صدیوں میں عوامی زندگی شدید اخلاقی بحران کا شکار تھی اسلام کی نظر میں وہ برائیاں جو قومی اور دینی زندگی کے لیے مہلک ہوتی ہیں ہندوستان معاشرہ میں رائج تھیں مگر بقول ایک ہندوستانی مبصر کے "عظیم سماجی مصلحتیں جیسے نانک اور صوفیا، دبیشوا جیسے کبیر چشتی یا نظام الدین اولیا دان سماجی برائیوں پر اپنی رائے ظاہر کیے بغیر گذر جاتے ہیں۔ اگرچہ انھوں نے غیر معمولی جوش کے ساتھ مذہبی چودھراہٹ کی مخالفت کی ہے لیکن اس مجاہدانہ اور نمایاں طریقہ پر ان اہم برائیوں کے خلاف جدوجہد نہیں کرتے[2] اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ صوفیا، کے نزدیک مخلوق سے کم آمیزی درویشی کا بنیادی اصول ہے۔ وہ مخلوق سے ملنے جلنے کو زہر قاتل سمجھتے ہیں چنانچہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی فرماتے ہیں "ایسے درویش! جب تک تو کم نہ لوگے اور لوگوں سے میل جول کم نہ کرے گا درویشی کا جوہر ہرگز تجھ میں پیدا نہ ہوگا، کیونکہ درویش لوگوں کا وہ گروہ ہے جس نے اپنے لیے نیند حرام کی ہے اور بات کرنے میں زبان گونگی بنالی ہے، عمدہ کھانے مٹی میں ملادیا ہے اور لوگوں کی صحبت کو زہریلے سانپ کی طرح خیال کیا ہے[3]" ظاہر ہے کہ جب مخلوق سے آمیزش اصول تصوف

---

[1] K. M. Ashraf. Life and Condition of the people of Hindustan P. 20, Delhi, 1970

[2] ایضاً ص۲۳ ۔

[3] فوائد السالکین ص۳۲ ملفوظات خواجہ قطب الدین بختیار کاکی ۔

کے منافی ہو تو مخلوق کی اصلاح کا بس ایک ہی طریقہ رہ جاتا ہے کہ لوگ خود اپنے گناہوں کو محسوس کریں اور توبہ کی نیت کرکے صوفیاء کا قصد کریں۔

رفتہ رفتہ تصوف لوگوں کی اصلاح کرنے کے بجائے خود قابل اصلاح بن گیا۔ بدعات وخرافات تصوف کی شناخت کا ذریعہ بن گئیں۔ سلسلہ تصوف کے حامی ڈاکٹر خلیق احمد نظامی کہتے ہیں کہ "چودہویں صدی کے نصف آخر میں تصوف نے ہندوستان میں نہایت ہی بدنما شکل اختیار کرلی تھی اور صدہا مخرب اخلاق رسمیں اور گمراہ کن بدعات عام ہوگئی تھیں، ایک بڑی گمراہی یہ تھی کہ عورتیں کثیر تعداد میں مزارات پر جاتی تھیں اور شہر کے لونڈے اور اوباش مردان کے پیچھے ہو لیتے تھے اور مزارات پر طرح طرح کی حیا سوز حرکتیں ظہور میں آتی تھیں۔[1]"

اٹھارہویں صدی عیسوی تک پہونچتے پہونچتے تصوف، الحاد و گمراہی، فاسد رسوم محرمات، بداخلاقی اوہام پرستی اور نفس پرستی کا مجموعہ بن چکا تھا، ہر چند کہ ایسے صوفیا بھی رہے جو مذکورہ برائیوں سے پاک تھے مگر ان کی تعداد کم تھی، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی م ۱۱۷۶ھ نے اپنے عہد کے گمراہ صوفیاء کو آٹھ گروہوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر گروہ کے غلط کردار پر روشنی ڈالی ہے۔[2] انھوں نے مسلمانوں کو جو مشورہ دیا ہے وہ نہایت معنی خیز ہے کہ "اس دور کے مشائخ کے ہاتھ پر ہرگز بیعت نہیں کرنی چاہیے اور غلو عام سے دھوکا نہ کھانا چاہیے اور نہ کرامت سے دھوکا کھانا چاہیے۔ اس لیے کہ اکثر عوام کا تعلق غلو رسم کی وجہ سے ہے اور رسمی امور کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔"[3]

۱ھ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ص۴۲۸۔

۲ھ التفہیمات الالٰہیہ ۱/۱۱۳، مجلس علمی ڈابھیل۔

۳ھ المقالۃ الوضیۃ فی النصیحۃ والوصیۃ، التفہیمات الالٰہیہ ۱/۱۱۴۔

امام ابوالمظفر السمعانیؒ

حیات وخدمات

تحریر: ثناء اللہ بھٹو
ترجمہ: محمد جرجیس کریمی

اسلام تمام شعبۂ حیات کو محیط ہے اور فرد ومعاشرہ کی تعلیم وتربیت کا اہتمام کرتا ہے۔ اس میں علم کی بڑی اہمیت جتائی گئی ہے اور علما، کو انبیا، کا وارث قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ شریعت اسلامیہ سے ایک بے مثال تہذیب کی تشکیل ہوئی اور اس میں بڑے بڑے علما، پیدا ہوئے اور انھوں نے علوم وفنون کے فروغ کے لیے اپنی زندگیاں صرف کردیں۔

اسلامی تہذیب کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس کے نامور علما، نے ہر شعبۂ علم میں بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ انہی میں علامہ امام ابو المظفر السمعانیؒ بھی ہیں جو پانچویں صدی ہجری کے اندر ایک مفسر، فقیہہ کی حیثیت سے گذرے ہیں اور جو مفتیٔ خراسان کے نام سے مشہور ہیں۔ زیر نظر مضمون انہی کی حیات وخدمات پر مشتمل ہے۔

نام اور نسب

آپ کا نام منصور بن محمد بن عبد الجبار ابن الفضل بن الربیع بن مسلم بن عبد اللہ ہے۔ قبیلہ بنی تمیم کی نسبت سے تمیمی کہلاتے ہیں۔ آپ ایک صوفی، بزرگ، امام، زاہد، متقی اور پرہیز گار عالم تھے پوری اسلامی دنیا میں آپ کے فضل وتقویٰ کی شہرت تھی اور مفتی خراسان کے لقب سے معروف تھے۔ آپ کی ولادت ذی الحجہ ۴۲۶ھ میں خراسان کے ایک بڑے شہر مروشاہجہاں میں ہوئی۔

خاندان

سمعان کی نسبت سے آپ کو سمعانی کہا جاتا ہے جو قبیلہ بنی تمیم کے ایک خاندان کی طرف منسوب ہے۔ اسلامی دنیا میں اس وقت آپ کا خاندان علم و فضل کے معاملہ میں نہایت ممتاز اور فائق تھا۔ جس نے مشرق وسطیٰ میں اسلامی عقیدہ و افکار کی کافی نشر و اشاعت کی اور خراسان میں بھی اس کی دینی خدمات قابل قدر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے خاندان کو مادی اور معنوی اعتبار سے جس طرح بلندی عطا فرمائی تھی اسی طرح علوم شرقیہ اور امور دینی میں بھی ان کا خاص مقام تھا بالخصوص فقہ، حدیث اور تفسیر کے علوم میں اس خاندان نے ایسے قدآور علماء پیدا کیے جنھیں امامت و قیادت کا مقام حاصل تھا۔ علم و قضا کی مسندیں ان سے مزین ہوگئیں اور متعدد مقامات پر افتاء اور تدریس کے فرائض بھی ان کے ذریعہ انجام پائے۔ یہ بات بہت مشہور ہے کہ مرو میں اسلامی کتب پر مشتمل دس بڑی لائبریریاں تھیں جن میں سے دو خاص امام موصوف کے خاندان کی ملکیت تھیں۔

امام سمعانیؒ کی سوانح اور ان کی خدمات کو ذکر کرنے سے پہلے مناسب ہے کہ اس دور کے سیاسی دینی اور ثقافتی حالات پر بھی روشنی ڈال دی جائے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ ان کی شخصیت کے ارتقا میں ان حالات کا اثر کہاں تک ہے۔

سیاسی حالات

امام سمعانیؒ ۴۲۶ھ میں پیدا ہوئے اور ۴۸۹ھ میں وفات پائی ان کی زندگی ۶۳ برس پر مشتمل ہے۔ اس دور میں اسلامی دنیا میں مختلف قسم کے انقلابات رونما ہوئے۔ امام سمعانی نے جب شعور کی آنکھیں کھولیں تو اس زمانے کے سیاسی حالات نہایت ابتر تھے۔ بہائیوں کا ایران کے کچھ علاقوں پر تسلط تھا اور بغداد کی عباسی حکومت میں انھیں کافی اثر و رسوخ حاصل تھا۔ یہ لوگ غالی شیعہ تھے۔ تاہم یہ ان کا آخری دور تھا۔ ان کے مقابلے میں سلجوقی لوگ تھے۔ جو بڑی چالاکی اور ہوشمندی سے اپنے اقتدار کی جڑیں مضبوط کر رہے تھے اور اس مہم میں زیادہ جرأت و شجاعت کا ثبوت دے رہے تھے۔

سلاجقہ ترکمان قبائل کے مجموعہ کا نام ہے۔ جو اپنے آپ کو اپنے سردار سلجوق کی طرف

۵۷م

منسوب کیا کرتے تھے۔ یہ لوگ ترکستان کے میدانی علاقوں کے رہنے والے تھے۔ پھر انھوں نے مسلمانوں کے شہروں کا رخ کیا اور سامانیوں، خانیوں اور غزنیوں کے پڑوس میں آباد ہونا شروع ہوئے۔ جنھیں ماوراء النہر کے علاقوں میں اقتدار حاصل تھا۔ ان کے ساتھ اس قربت نے سلجوقیوں کو اسلام اور سنی مذہب سے متعارف کرایا۔ پھر انھوں نے دریائے سیحون کے ساحلی علاقوں کے زرخیز آراضی پر اپنی مستقل آبادیاں قائم کیں پھر ۳۸۹ھ میں خانیوں، سامانیوں اور غزنیوں کے آپسی جھگڑوں کی وجہ سے سلجوقیوں کو یہ موقع مل گیا کہ وہ مال و دولت اور فوجی ساز و سامان کے اعتبار سے لیس ہو جائیں اور چند سالوں کے اندر ہی اندر انھوں نے ایک ایسی فوج تیار کر لی جو اپنی تعداد اور وسائل کے اعتبار سے پوری طرح لیس تھی۔

قرآن و سنت سے وابستگی کے معاملہ میں ان کے یہاں ایک قسم کی شدت اور صلابت پائی جاتی تھی جس کی وجہ ان کی بدویانہ سادگی اور قبائلی زندگی ہے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ انھوں نے اسلام ایسے حکام کے ذریعہ قبول کیا تھا جو خود کو اہل السنہ والجماعت کہتے تھے۔ اسی طرح بغداد کے عباسی خلیفہ سے اظہار وفاداری کے معاملہ میں بھی ان کا جذباتی رویہ نمایاں تھا۔

خانیوں اور غزنیوں نے اس نوزائیدہ سلجوقی قوت کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا چنانچہ سلطان محمود غزنوی نے سلجوقی لیڈر اسرائیل سلجوق کو قید کر کے جیل میں ڈال دیا حتیٰ کہ اس کی وہیں موت واقع ہو گئی، اس کے بھائی میکائیل سلجوقی نے اپنے بھائی کے خون کا بدلہ لینے کے لیے ایک منصوبہ بنایا اور خراسان میں قیام کر کے غزنوی حکومت کے خلاف اس نے اپنی سرگرمیاں شروع کر دیں، سلطان محمود غزنوی کی وفات کے بعد اس کے بیٹے مسعود غزنوی سے اس نے اپنے بھائی کے قتل کا انتقام لے لیا۔ ۴۳۱ھ میں داندانقان کے مقام پر غزنیوں اور سلجوقیوں کے درمیان گھمسان کی لڑائی ہوئی جس میں غزنیوں نے شکست کھائی۔ اس جنگ میں سلجوقی فوج کی قیادت طغرل بیگ کر رہا تھا اور غزنویوں کی سربراہی مسعود غزنوی کے ہاتھ میں تھی۔ اس طرح سلجوقیوں نے وہاں اپنی حکومت قائم کر لی۔ دوسری طرف خلافت عباسیہ کا حال یہ تھا کہ اس نے ابتداءً سلجوقیوں کی حکومت کو تسلیم نہیں کیا لیکن ۴۳۲ھ میں اس نے اس حکومت کو تسلیم کر لیا، اس طرح سلجوقیوں کو

ماوراء النہر کے علاقہ پر شرعی حکومت کی حیثیت حاصل ہوگئی، طغرل بیگ کے ارادے بلند تھے چنانچہ اس نے ایران کے سارے علاقوں میں قیام حکومت کے لیے ایک نقشۂ عمل تیار کیا اور ۴۳۲ھ سے اس نے اپنے نقشہ کے مطابق اقدامات کا آغاز کیا اور ۴۴۶ھ تک اس کا منصوبہ مکمل ہوگیا۔ وہ اب ایران کے مشرقی، مغربی اور جنوبی علاقوں پر قابض ہو چکا تھا اور اس کی بدولت بغداد کے عباسی خلیفہ نے بھی اس کی اہمیت اور حیثیت کو تسلیم کرلیا عباسی خلافت یہ دیکھ رہی تھی کہ عراق کے اندر فاطمیوں کا اثر و نفوذ بڑھتا جا رہا ہے اور بہائی بھی وہاں اپنے مسلک کی نشر و اشاعت کر رہے ہیں نیز ترک اور دیلمی افواج کی ایک کثیر تعداد نے فاطمی مسلک کو قبول کرلیا ہے۔ چنانچہ عباسی خلیفہ قائم بامراللہ نے اس خطرے کے خلاف سلجوقیوں کو استعمال کرنا چاہا اس نے امیر طغرل بیگ کے پاس ایک وفد بھیجا اور انھیں زیارت بغداد کی دعوت دی۔ چنانچہ طغرل بیگ ۴۴۷ھ میں بغداد آیا۔ خلیفہ عباسی کے حکم سے وہاں کی مساجد میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور سکوں پر اس کا نام نقش کیا گیا۔

طغرل بیگ نے بغداد آنے کے بعد فاطمیوں کے اثرات کی بیخ کنی شروع کی اور بہائیوں کے اثرات کا خاتمہ کردیا۔ خلافت عباسی میں یہ دم خم نہ تھا کہ وہ سلجوقیوں کے بڑھتے ہوئے اثرات کا مقابلہ کرتے چنانچہ طغرل بیگ کا بغداد آنا وہاں پر اس کے غلبہ و تسلط کا پیش خیمہ ثابت ہوا اور بغداد بھی گویا سلجوقی حکومت کا ایک حصہ بن گیا۔ جہاں عباسی حکومت کا صرف نام اور رسم باقی رہ گیا۔ امام سمعانی نے اپنے عہد میں جن تین سلجوقی بادشاہوں کا دور دیکھا ان کے نام یہ ہیں واضح رہے کہ ان کے دور میں ریعان میں سلجوقی حکومت اپنے شباب پر تھی۔

۱۔ امیر طغرل بیگ محمد بن میکائیل ۴۲۹ھ تا ۴۵۵ھ۔
۲۔ عضدالدین الپ ارسلان ابوشجاع ۴۵۵ھ تا ۴۶۵ھ۔
۳۔ جلال الدین ابوالفتح ملک شاہ ۴۶۵ھ تا ۴۸۵ھ۔

یہ اس زمانے کی سیاسی صورت حال تھی۔

دینی حالات

اس زمانے کی دینی صورت حال بھی روبہ زوال تھی۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ بہت سے

دینی فرقے وجود میں آچکے تھے اور لوگوں کے فکر وعقیدہ کو بری طرح متاثر کر رہے تھے۔ اس کا سب سے درد انگیز پہلو یہ ہے کہ اب وہ خالص دینی فضا باقی نہیں رہی تھی جس کا مشاہدہ انسانی آنکھوں نے خلفاء راشدین کے عہد میں کیا تھا۔ اس دور کے ہر فرقے کی اپنی اپنی سرگرمیاں تھیں جن کی تفصیل ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔

اہلِ سنت

اہل سنت سے مراد وہ لوگ ہیں جو کتاب وسنت کو مرجع خالص تصور کرتے ہیں اور مضبوطی کے ساتھ وہ اس پر قائم ہیں اس کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجات کی خوشخبری دی ہے۔ (ما انا علیہ واصحابی) سلجوقی اسی جماعت سے خود کو منسوب کیا کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے دوسرے مذاہب کے مقابلے میں سنی مذہب کو خاص تقویت حاصل ہوئی جبکہ شیعہ حضرات نے بہائیوں کے دور حکومت میں اسے تقریباً فنا ہی کر دیا تھا۔ اور فاطمیوں نے بغداد میں اپنا غلبہ جمانے کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔

شیعہ

سنی مذہب کے مقابلے میں ہر جگہ اور ہر دور میں شیعیت سب سے بڑا مذہب رہا ہے اور مرور زمانہ کے ساتھ اس میں ترقیاں بھی ہوتی رہی ہیں حتیٰ کہ اس کے افراد اسلامی حکومتوں کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے ہیں جس کی وجہ سے خلفاء اور حکام میں شیعیت کا میلان پیدا ہوا اور چوتھی اور پانچویں صدی ہجری کے دوران بہائیوں کے ذریعہ اسلامی حکومتوں پر اس کو قبضہ بھی حاصل ہوا لیکن سلجوقی اپنے مذہب پر قائم رہے اور عباسی خلافت کے حامی ومددگار بنے رہے اور مشرق وسطیٰ خصوصاً ایران میں اپنے غلبہ اور اپنے مسلک کے مطابق حکومت بھی قائم کی۔ لیکن اس کے باوجود وہ شیعیت کی مکمل بیخ کنی سے قاصر رہے اور اس کا وجود باقی رہا اس صورت حال میں شیعیت اپنے اندرونی حالات کی تنظیم وتربیت میں لگ گئی اور مدرسوں اور مسجدوں میں اپنے عقائد کی ترویج واشاعت پر اپنی ساری قوت مرکوز کر دی اور ہر موقع کو غنیمت جان کر اس سے خوب فائدہ اٹھایا۔

معتزلہ

یونانی فلسفہ میں حد سے زیادہ استغراق کی بدولت یہ مسلک وجود میں آیا جبکہ یونانی فلسفے فرضی خیالات تھے جن کی بنیادیں موہوم تھیں لیکن ان کے ساتھ ثابت شدہ حقائق کا معاملہ کیا جانے لگا۔ مامون الرشید کے اس نظریہ کی طرف میلان کی وجہ سے معتزلیوں کو اسلامی حکومت میں قدم جمانے کا موقع ملا اور نت نئے فلسفیانہ فتنے اٹھنے لگے۔ خلق قرآن کے مسئلہ نے دوسری اور تیسری صدی ہجری کے اندر عالم اسلام میں ناخوشگوار اثرات مرتب کیے پھر ابوالحسن اشعریؒ کے زمانے میں اعتزال کا زور کچھ ٹوٹا کیونکہ موصوف نے اس کے نظریات وعقائد کو مستحکم دلائل کے ساتھ باطل قرار دے دیا تھا۔ ان کے بعد امام ابوحامد غزالیؒ نے اس فلسفہ کے مسلمات کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا۔ اس طرح یونانی فلسفہ کا محل زمیں بوس ہوگیا اور اس فتنہ پر مبنی تمام باطل نظریات کا پرچم سرنگوں ہوگیا۔

ثقافتی حالات

پانچویں صدی ہجری یعنی سلجوقیوں کے دور عروج میں دنیا میں اسلامی ثقافت ارتقاء پذیر تھی جس میں عربی زبان وادب اور اسلامی علوم کو فروغ حاصل ہوا اور اس سے ایسے مثبت نتائج برآمد ہوئے جن سے امت مسلمہ خوب خوب مستفید ہوئی۔ اسلامی تہذیب کا دوسری تہذیبوں سے اختلاط ہوا اور اس کی بناء پر فکر اسلامی کے فروغ اور عربی زبان کے ارتقاء واستحکام میں کافی مدد ملی۔ مسلمانوں کا ایسی تہذیبوں سے رابطہ ہوا جن کے پاس مختلف قسم کے عقلی ونقلی علوم تھے وہ ان سب کے وارث بن گئے۔
اس طرح اسلامی افکار وعقائد کی خوب اشاعت ہوئی اور مسلمانوں میں بحث وتحقیق تالیف وتصنیف اور ترجمہ کی تحریک پیدا ہوئی اور اسلامی دنیا میں طالب علموں اور عالموں کی نقل وحرکت تیز تر ہوگئی۔

یوں تو مسلمانوں میں تعلیم وتدریس کا آغاز عہد نبویؐ ہی میں ہو چکا تھا لیکن اس وقت مسجدوں میں محدود طور پر یہ نظام قائم تھا مگر سلجوقیوں کی یہ یادگار ہے کہ انھوں نے مستقل عربی مدارس کی تنظیم وتشکیل کا بیڑا اٹھایا اور معقول انداز میں بڑے بڑے مدارس قائم کیے جس

میں طلباء کو ہر طرح کی سہولیات فراہم کی جاتیں۔ اس بارے میں سلطان نظام الملک امیر الپ ارسلان اور ان کے لڑکے ابو الفتح ملک شاہ کے وزیر نظام الملک طوسی کی کوششیں خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ نظام الملک الطوسی ایک جید عالم تھا وہ طوس میں قرآن و سنت کا درس دیا کرتا تھا۔ علوم اور اہلِ علم کا قدر شناس تھا۔ وہ طالب علموں کی قدر کرتا تھا، ان میں نمایاں افراد کی تلاش کرتا تھا اور ان کے لیے مدارس قائم کرتا۔ مدارس کے لیے جاگیریں وقف کرتا۔ ہر مدرسہ میں لائبریری ہوتی علماء کے لیے وظائف متعین ہوتے جن سے وہ معاشی تنگ ودو سے بے نیاز ہو سکیں اور وہ درس وتدریس اور علوم ومعارف کی تبلیغ و اشاعت کے لیے یکسو ہو سکیں۔

الطوسی نے اصفہان، نیشاپور اور مرو جیسے بڑے بڑے شہروں میں بھی دینی مدارس قائم کیے اس اقدام سے علم کی دنیا میں ان کا نام ہمیشہ کے لیے ایک نامور علم پرور کی حیثیت سے مشہور ہو گیا۔ ان مدارس کو قبولِ عام حاصل ہوا۔ دنیا کے ہر حصہ سے طلبہ اور نامور علماء وہاں آنے لگے۔

امام سمعانی نے شافعیؒ مسلک کے ایک مدرسہ میں بھی تعلیم پائی تھی۔ اس کے علاوہ بوشنج میں ابن خاضرۃ الاسدی البغدادی متوفی ۴۵۰ھ کا ایک مدرسہ تھا۔ یہی وہ مدرسے تھے جنہوں نے فکری تحریک کی پرورش میں اہم رول ادا کیا اور جہاں سے مختلف خطوں کے طالبان علم نے کسب فیض کیا۔ ان ہی طالب علموں میں ابو المظفر سمعانی بھی تھے۔

مستزاد یہ کہ مسجدوں میں لائبریریاں قائم تھیں، جہاں مختلف علوم وفنون پر کتابوں کا ذخیرہ ہوتا تھا اسی طرح باحیثیت لوگوں نے اپنی ذاتی لائبریریاں قائم کر رکھی تھیں جن سے اسلامی علوم وفنون کو کافی عروج حاصل ہوا۔

اس کے علاوہ سلجوقیوں نے ایران اور ماوراء النہر کے علاقوں میں بھی علمی اور ثقافتی خدمات انجام دیں۔ یہی وہ سیاسی دینی اور علمی وثقافتی ماحول تھا جس میں امام سمعانی نے پرورش پائی اور ان کی شخصیت کی تعمیر وتشکیل میں اس نے اپنا حصہ ادا کیا۔

پرورش

امام سمعانی کی پرورش ایسے علمی ماحول میں ہوئی جہاں علم ومعرفت کا ہر طرف چرچا

تھا ہر قسم کے دینی علوم کے ماہرین موجود تھے ان کے والد امام محمد بن عبد الجبار بن احمد القاضی مسلک حنفی کے امام تھے ان سے آپ نے فقہ میں دسترس حاصل کی۔ علامہ سبکی فرماتے ہیں کہ "امام سمعانی نے اپنے والد سے طفولیت سے پیری تک حدیث سنی ہے" لیکن امام موصوف نے صرف اپنے والد ہی سے تحصیل علم نہ کیا بلکہ اور بھی دیگر اساتذۂ وقت سے شرف تلمذ حاصل کیا جس کے لیے انھیں بغداد اور حجاز کا سفر کرنا پڑا تب جاکر انھیں تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علوم میں مہارت حاصل ہوئی۔ مفتیٔ خراسان کے مقام تک پہنچے۔ علم کی دنیا میں انھیں قابلِ قدر مقام حاصل ہوا اور نمایاں علما میں ان کا شمار ہونے لگا۔

علمی اسفار

امام سمعانی ۴۶۱ھ میں بغداد آئے اور عراقی علماء سے تحصیل علم کیا پھر حجاز گئے حجاز کے سفر میں ان کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ہوا یہ کہ عرب کے کچھ دیہاتیوں نے انھیں قید کرلیا اور اونٹوں کی رکھوالی کا کام سپرد کیا۔ ان عرب دیہاتیوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ انھوں نے کیسے بڑے عالم کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ اس قبیلے کے سردار نے شادی کا ارادہ کیا اور عقد کے لیے کسی عالم کی تلاش کے ارادہ سے کسی دوسرے شہر کے سفر کا ارادہ کر رہا تھا تو امام کے قیدی ساتھیوں میں سے ایک نے اسے بتایا کہ تم نے جس شخص کو اونٹوں کے چرانے پر لگا رکھا ہے خراسان کا فقیہ ہے۔ یہ سن کر اس نے امام کو طلب کیا اور ان سے امتحاناً کچھ سوالات کیے آپ نے ان کے جوابات عربی زبان میں دیے اس پر وہ بہت نادم ہوا اور ان سے اپنے فعل کی معذرت چاہی۔ چنانچہ امام نے اس کا نکاح پڑھا دیا۔ سردار نے انھیں کچھ نذرانہ پیش کیا جسے آپ نے قبول نہیں کیا۔ جس سے ان کی نگاہ میں آپ کی عزت اور بھی زیادہ ہوگئی۔ چنانچہ انھوں نے عزت و تکریم کے ساتھ آپ کو مکہ مکرمہ پہنچا دیا۔ آپ نے وہاں کے علماء سے کسب فیض کیا اور پھر حج کرکے خراسان واپس آگئے۔ ان کی واپسی ۴۶۸ھ میں ہوئی۔

تبدیلیٔ مسلک

امام سمعانی نے بغداد اور حجاز کے سفر سے واپس آنے کے بعد شافعی مسلک کو

اختیار کرنے کا اعلان کر دیا اس کی وجہ یہ تھی کہ حنفی مسلک کے فقہی مبادیات پر انھیں اطمینان نہیں تھا اور اس کے مقابلے میں شافعی مسلک کے فقہی اصول انھیں زیادہ موزوں اور مناسب معلوم ہوئے۔ امام سمعانی جیسا عالم اگر یہ اقدام کرتا ہے تو اس کی بنیاد پر انھیں مستحق ملامت نہیں سمجھا جا سکتا اس لیے کہ وہ بہر حال علم و فہم، ذہانت و فطانت اور دینداری و تقویٰ میں یکتائے روزگار تھے۔

جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ ایک شخص اپنی خواہشات نفس کی تسکین کی خاطر ایک مسلک کو چھوڑ کر دوسرا مسلک اختیار کرتا ہے یا کچھ رخصتوں اور رعایتوں سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے تو اس کی اجازت ائمہ اربعہ سے کسی نے نہیں دی ہے۔ اس لیے کہ یہ اقدام دین اور شعائر دین سے کھلواڑ کے مترادف ہے۔

امام سمعانی کے تبدیلی مسلک کا ایک اہم سبب یہ تھا کہ اس زمانہ میں مسلک حنفی کے علما، پر فرقہ قدریہ کے افکار کا غلبہ تھا۔ ان کے پوتے اپنے دادا کے بارے میں فرماتے ہیں کہ جب انھوں نے اپنا مسلک تبدیل کیا تو ان کے بھائی نے ازراہِ نفرت وکراہت ان سے ترک تعلق کر لیا۔ امام موصوف نے اپنے بھائی کے نام ایک خط میں یہ صراحت کی کہ میں نے اصول کے معاملہ میں اپنے والد رحمہ اللہ کا مسلک ترک نہیں کیا ہے بلکہ میں نے قدریہ مسلک سے علیحدگی اختیار کی ہے۔ اس لیے کہ مرو والے عقیدے کے اعتبار سے قدری ہوتے جا رہے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے قدریہ کی تردید میں بیسؔ جلدوں پر مشتمل ایک ضخیم کتاب لکھی جسے انھوں نے اپنے بھائی کو تحفۃً بھیجا۔ اسے پڑھ کر وہ آپ کے طرز عمل سے مطمئن ہو گئے اور ان کے دل کی کدورت جاتی رہی یہی نہیں بلکہ انھوں نے اپنے بیٹے کو آپ سے علم و فقہ سیکھنے کی ہدایت کی چنانچہ وہ ایک مدت تک آپ سے استفادہ کرتے رہے۔ جب امام سمعانی نے تبدیلی مسلک کا اعلان کیا تو لوگوں نے انھیں مطعون کرنا شروع کر دیا حتیٰ کہ اس بارے میں لوگوں کے دو گروپ بن گئے اور ان میں تصادم کی صورت حال پیدا ہو گئی جس کو دیکھ کر امام موصوف نے کچھ دنوں کے لیے شہر چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ رمضان ۴۶۸ھ میں وہ وہاں سے نکل گئے اور طوس کا رخ کیا پھر وہاں سے نیشاپور آئے جہاں ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ نیشاپور میں ایک طویل عرصہ قیام کے بعد وہ پھر ۴۷۹ھ میں مرو واپس آ گئے اس

۴۶۴

وقت تک تعصب کی فضا سرد ہو چکی تھی۔ انھوں نے وہاں جم کر پہلے سے زیادہ بڑے پیمانے پر علم و دین کی خدمت شروع کی۔

امام سمعانی نے جرجان، اصبہان، ہمدان اور قزوین کے اساتذۂ وقت سے استفادہ کیا ہے۔ ذیل میں ان کے چند اساتذہ اور شاگردوں کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے۔

اساتذہ

آپ کے اساتذہ کی مکمل فہرست مہیا کرنا آسان نہیں ہے کیونکہ ان کی تعداد بہت ہے اس سلسلے میں امام موصوف کی کتاب معجم الشیوخ دیکھنا مفید رہے گا جس میں انھوں نے اپنے اساتذہ اور تلامذہ کا مفصل تذکرہ جمع کیا ہے۔ علامہ ابن خلکان فرماتے ہیں کہ "انھوں نے ایک ہزار حدیثوں کو سو شیوخ سے سن کر جمع کیا ہے، ان کے پوتے ابوسعد لکھتے ہیں کہ "میرے دادا نے خراسان، جرجان اور حجاز کے اساتذہ وقت کی ایک بڑی جماعت سے استفادہ کیا ہے۔ علامہ سبکی نے لکھا ہے کہ انھوں نے خراسان، عراق اور حجاز کے شیوخ سے فیض حاصل کیا ہے۔ آپ کے چند مشہور اساتذہ یہ ہیں۔

۱۔ ابراہیم بن علی بن یوسف، جمال الدین (ابواسحاق) فیروزآبادی شیرازی، متوفی ۴۷۶ھ ان سے امام سمعانی نے بغداد میں استفادہ کیا۔

۲۔ احمد بن عبدالملک بن علی، ابوصالح المؤذن متوفی ۴۷۰ھ ان سے نیساپور میں استفادہ کیا۔ یہ امام بغوی کے بھی استاد ہیں۔

۳۔ احمد بن علی بن اسد بن احمد بن باذل الکوجی "ابوالعباس" ۴۶۰ھ کے بعد ان کی وفات ہوئی۔ حسن بن احمد المروزی بیان کرتے ہیں کہ میں امام سمعانی کے ساتھ حج کے لیے گیا تھا جب وہ مکہ پہنچے تو احمد بن اسد الکوجی کے یہاں قیام پذیر ہوئے جہاں امام موصوف نے ان سے استفادہ کیا۔

۴۔ احمد بن علی بن الحسین الکرائی "ابوغانم" متوفی ۴۴۴ھ یہ امام سمعانی کے سب سے بڑے استاد ہیں ان سے مرو میں فیض حاصل کیا۔

۵۔ احمد بن محمد بن احمد بن عبداللہ ابوالحسن البزار المعروف بابن النقور متوفی ۴۷۰ھ امام سمعانی نے اپنی تفسیر کے اندر ان سے احادیث کی روایت کی ہے۔

۴۶۵

۶۔ بکر بن محمد بن علی بن حید بن عبدالجبار بن النضر بن مسافر بن قصی، ابو منصور متوفی ۴۶۲ھ یہ تفسیر کے استاد تھے۔

۷۔ الحسن بن عبدالرحمٰن بن الحسن بن محمد بن احمد بن ابراہیم بن عبداللہ ابو علی شافعی متوفی ۴۷۴ھ ان سے آپ نے مکہ میں استفادہ کیا۔

۸۔ سعد بن علی بن محمد بن علی بن الحسین ابوالقاسم الزنجانی متوفی ۴۷۱ھ ان سے آپ نے مکہ میں فیض حاصل کیا۔

۹۔ عبدالسید بن محمد بن عبدالواحد بن احمد بن جعفر ابو نصر بن الصباغ متوفی ۴۷۷ھ ان سے امام سمعانی نے علمی بحثیں کیں اور استفادہ کیا۔

۱۰۔ عبدالصمد بن علی بن محمد بن الحسن بن الفضل بن المامون ابو غانم الہاشمی متوفی ۴۶۵ھ ان سے آپ نے بغداد میں فیض حاصل کیا۔

۱۱۔ عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن احمد القفال، ابو عبداللہ، امام سمعانی نے اپنی تفسیر میں ان سے روایت کی ہے۔

۱۲۔ عبداللہ بن محمد بن عبداللہ بن عمر بن احمد بن المجمع بن ہزار مرد الصریفینی، ابو محمد متوفی ۴۶۹ھ ان سے امام کا سماع ہے۔

۱۳۔ کریمہ بنت احمد بن محمد بن حاتم المروزیہ، ام الکرام، متوفی ۴۶۳ھ۔ امام موصوف نے ان سے اپنی تفسیر میں مستند احادیث بیان کی ہیں اور انھیں پڑھ کر بھی سنایا ہے۔

۱۴۔ محمد بن احمد بن محمد بن عمر بن الحسن السلمی البغدادی الحافظ، ابو جعفر بن المسلمہ، متوفی ۴۶۵ھ ان سے امام سمعانی نے استفادہ کیا ہے۔

۱۵۔ محمد بن اسماعیل بن محمد بن ابراہیم بن کثیر استرابادی، ابو حاجب متوفی ۴۶۸ھ امام سمعانی نے ان سے سماعت کی۔

۱۶۔ امام محمد بن عبدالجبار بن احمد بن محمد بن جعفر بن احمد بن عبدالجبار بن الفضل السمعانی التیمی متوفی ۴۵۰ھ یہ امام موصوف کے والد محترم ہیں۔ بچپن ہی سے ان سے استفادہ کیا۔ عبدالغافر فرماتے ہیں کہ "امام سمعانی نے اپنے والد سے فقہ میں مہارت حاصل کی۔

۱۷۔ محمد بن عبدالصمد الترابی، ابو بکر المعروف بابی الہیثم متوفی ۴۶۳ھ ان سے مرو میں استفادہ کیا۔ یہ امام بغوی کے بھی استاد ہیں۔

۱۸۔ محمد بن علی بن محمد بن عبید اللہ بن عبد الصمد جو ابوالحسین بن المہتدی اور ابن الغریق کے نام سے معروف ہیں ۔متوفی ۴۶۵ھ ۔ان سے امام سمعانی نے بغداد میں استفادہ کیا۔

۱۹ ۔ المکی بن عبد الرزاق الکشمیہنی، ابو محمد المکی ۔امام سمعانی نے ان سے تفسیر میں روایت کی ہے، سلسلہ سند یہ ہے عن المکی عن جدہ ابی الہیثم ۔

۲۰ ۔ہیاج بن عبید بن الحسین الحطینی، ابو محمد، مفتی مکہ، متوفی ۴۷۲ھ ۔ان سے امام سمعانی نے مکہ میں استفادہ کیا۔

تلامذہ

آپ کے اساتذہ کی طرح تلامذہ بھی بہت ہیں جنھوں نے شہرت پائی ان میں سے کچھ تلامذہ کا ذکر کیا جاتا ہے ۔

۱۔ ابراہیم بن احمد بن محمد، ابو اسحاق المروزی متوفی ۵۳۶ھ ۔

۲۔ اسعد بن محمد بن ابو نصر المیہنی ۔متوفی ۵۲۷ھ ۔

۳ ۔اسماعیل بن ابوصالح احمد بن عبد الملک بن علی بن عبد الصمد بن احمد، ابوسعد الموذن، متوفی ۵۳۲ھ ۔

۴۔ الجنید بن محمد بن علی، ابوالقاسم القایینی متوفی ۵۴۷ھ ۔

۵ ۔عبد الرحمٰن بن عمر بن ایوب بن عبد الرحمٰن بن الحسین بن محمد بن علی، ابوالقاسم الصدقی، متوفی ۵۳۰ھ ۔

۶ ۔عبد الرحمٰن بن محمد بن عبد الرحمٰن بن ابوالفضل البوبنجی الجوبیاری متوفی ۵۲۸ھ ۔

۷ ۔عبد الرحیم بن محمد بن عبد الرحمٰن بن الشافعی ابو محمد الفندینی متوفی ۵۲۹ھ ۔

۸ ۔عبد الرزاق بن عبد اللہ بن اسحاق الطوسی ابوالعالی القدیر، متوفی ۵۱۵ھ ۔

۹ ۔عبد اللہ بن عمر بن محمد بن ابومعشر الغزنوی متوفی ۵۲۸ھ ۔یہ مرو کے رہنے والے تھے۔

۱۰ ۔عبد اللہ بن محمد بن الحسن الحامی ابو محمد المقری جو اولیاء کے نام سے معروف تھے۔ متوفی ۵۲۸ھ ۔مرو کے رہنے والے تھے ۔

۱۱ ۔عبد اللہ بن محمد بن عبد اللہ بن احمد بن عبد اللہ، ابو محمد الفندونی متوفی ۵۲۰ھ ۔

۱۲ ۔عمر بن عبد الرحیم ابوبکر الشاشی متوفی ۵۲۹ھ ۔

۶۷

۱۳۔ عمر بن علی بن ابو نصر ابو حفص الشیرازی متوفی ۵۲۹ھ۔

۱۴۔ فضل اللہ محمد بن محمود ابو الفتح الشجاعی المعروف بالسرۃ مرد متوفی ۵۲۸ھ یہ سرخس کے رہنے والے تھے۔

۱۵۔ المؤمل بن مرد بن ابو سہل بن مامون الشاشی الخرکی المامونی متوفی ۵۱۶ھ۔ یہ شاش کے رہنے والے تھے۔

۱۶۔ محمد بن ابو بکر بن محمد بن عبد اللہ السلیان المروزی، ابو عبد اللہ الرازی متوفی ۵۲۹ھ۔

۱۷۔ محمد بن سعید بن مسعود ابو الفضل المسعودی متوفی ۵۱۸ھ۔ مرو کے رہنے والے تھے۔

۱۸۔ محمد بن محمد بن یوسف ابو النصر الفاشانی المروزی متوفی ۵۲۹ھ۔ انھوں نے امام سمعانی سے صرف سماعت کی ہے۔

۱۹۔ محمد بن محمد بن عبد اللہ بن ابو سہل بن ابو طلحہ، ابو طاہر السنجی الحافظ متوفی ۵۴۸ھ۔

۲۰۔ محمد بن منصور بن محمد بن عبد الجبار السمعانی متوفی ۵۱۰ھ یہ امام موصوف کے لڑکے ہیں۔ ان کے بارے میں آپ کا کہنا تھا کہ "میرا لڑکا محمد علم وفضل میں مجھ سے بڑھا ہوا ہے۔

۲۱۔ محمود بن عبد الرحمٰن بن ابراہیم الفارسی ابو المجد الشیرازی متوفی ۵۲۵ھ۔

۲۲۔ منصور بن احمد بن الفضل بن نصر بن عصام المنہاجی، ابو القاسم الاسفزاری متوفی ۵۰۲ھ۔

۲۳۔ منصور بن محمد بن منصور بن عبد اللہ بن احمد، ابو المظفر الغازی متوفی ۵۲۹ھ۔ یہ ان کے تلامذہ کی مختصر فہرست ہے ان کے پوتے فرماتے ہیں کہ مجھ سے میرے دادا کے حوالے سے ہرات کے ابو القاسم الجنید اور بلخ کے ابو طاہر اور نیشاپور کے ابو بکر اور طوس کے ابو الولید اور اصبہان کے ابو منصور نے حدیث کی روایت کی ہے۔

ان کے علاوہ بھی بہت سے لوگوں نے دادا کے حوالے سے مجھ سے روایت کی ہے جن کی تعداد پچاس سے زیادہ ہوگی یہاں پر ان کے سارے تلامذہ کا ذکر ممکن نہیں ہے۔ علامہ ذہبی ان کے تلامذہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "ان سے خلق کثیر نے شرف تلمذ حاصل کیا ہے۔

امام سمعانی کے بارے میں متقدمین علمار کی آرار کا یہ خلاصہ ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ امام موصوف علم وفضل میں بلند مرتبہ کو پہونچے ہوئے تھے اور انھوں نے علم ودین کی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے

اور جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین۔

تصنیفات

مختلف موضوعات پر امام سمعانی کی تصانیف موجود ہیں۔ ان میں سے چند تصانیف کا ذکر کیا جاتا ہے۔

١۔ التفسیر الحسن الملیح۔ یہ تین جلدوں میں ہے۔ اس کی افادیت ہمہ گیر ہے۔ مدینہ یونیورسٹی میں اس پر تحقیقی کام ہو رہا ہے۔

٢۔ الانتصار لاصحاب الحدیث۔ فن حدیث پر یہ ایک مختصر کتاب ہے جس میں صرف تین ابواب ہیں۔ پہلا باب الحث علی السنۃ والجماعۃ کے عنوان سے ہے دوسرا باب فضل الحدیث کے عنوان سے ہے، تیسرا باب شجرۃ العلم کے عنوان سے ہے۔

٣۔ منہاج اہل السنۃ۔

٤۔ الرد علی القدریۃ۔ یہ کتاب بیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کے بارے میں تفصیل پیچھے گذر چکی ہے۔

٥۔ الاحادیث الالف الحسان۔ اس کتاب میں ایک سو شیوخ سے مروی ایک ہزار حدیثیں ہیں۔ ہر شیخ سے دس احادیث مروی ہیں۔

٦۔ القواطع۔ یہ کتاب اصول فقہ سے متعلق ہے۔ اس کتاب کو امام موصوف کے معاصر علماء نے کافی سراہا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن ہیتو اور عبداللہ بن حافظ الحکمی نے اس پر تحقیق کی ہے۔ موخر الذکر کو اس پر محمد بن سعود یونیورسٹی ریاض سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی گئی ہے۔

٧۔ البرہان۔ اس میں ایک ہزار اختلافی مسائل بیان کیے گئے ہیں۔

٨۔ کتاب الاوسط۔ یہ کتاب بھی اختلافی مسائل پر مشتمل ہے۔

٩۔ الاصطلام۔ یہ ابو زید الدبوسی کی ایک کتاب کی تردید میں ہے۔

١٠۔ الطبقات۔ ان کے علاوہ ان کی اور بھی متعدد تصانیف ہیں۔

وفات

امام سمعانی کی وفات ٢٣ ربیع الاول ٤٨٩ھ کو ہوئی۔ مرو کے ایک قبرستان

سنجدان میں مدفون ہیں۔

علامہ سمعانی کا علمی مقام، علماء کی نظر میں

امام سمعانی ایک ہمہ پہلو شخصیت کے مالک تھے معاصر اور بعد کے علماء نے ان کی شخصیت کو سراہا ہے اور ان کو امامت کا درجہ دیا ہے علامہ ابن خلکان فرماتے ہیں کہ "وہ اپنے زمانے کے امام تھے جس کا ان کے مخالفین کو بھی اقرار تھا۔
عقائد میں وہ امام تھے اور گمراہ فرقوں کے بارے میں وہ سب سے زیادہ حساس اور مخالف تھے۔ چنانچہ انھوں نے قدریہ کی تردید میں کتاب لکھی اور دوسرے گمراہ فرقوں سے مناظرے کیے آپ سنت پر سختی کے ساتھ عامل تھے اور بدعات کو سخت ناپسند کیا کرتے تھے۔ علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ اہل حدیث یعنی اہل سنت والجماعت سے آپ کی عصبیت اتنی گہری تھی کہ مخالفین کی نگاہوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتے تھے۔ جبکہ اہل سنت کے لیے ایک حجت تھے۔ فقہ اور افتاء میں بھی ان کی امامت مسلم تھی آپ کو اس عہد میں فقہ کا سب سے بڑا عالم تسلیم کیا گیا ہے۔ امام حرمین فرماتے ہیں کہ اگر فقہ کو ایک تہہ در تہہ کپڑا تصور کر لیا جائے تو امام سمعانی اس کے تہہ لگانے والے اور کھولنے والے تھے۔ ابو القاسم بن امام الحرمین فرماتے ہیں کہ "امام موصوف اپنے وقت کے امام شافعی تھے انھوں نے فقہ اور اصول فقہ میں بے مثال کتابیں تصنیف کیں۔ علامہ سبکی فرماتے ہیں کہ اصول فقہ میں 'القواطع' سے اچھی کتاب مجھے نہیں ملی۔
تصنیف وتالیف کی طرح دیگر فنون میں بھی آپ کو ید طولی حاصل تھا۔ آپ کے پوتے ابو سعد عبد الکریم فرماتے ہیں کہ "جو شخص امام موصوف کی تصانیف کا مطالعہ کرے گا، اسے ان کے علمی مرتبہ کا اندازہ ہو جائے گا" علامہ ابن الاثیر فرماتے ہیں کہ "عربی زبان میں ان کو مہارت حاصل تھی اور اس میں ان کی مفید تصنیفات ہیں"۔ تفسیر میں بھی انھیں درجہ امامت حاصل تھا ان کے پوتے کی روایت ہے کہ جس نے بھی ان کی تفسیر کا مطالعہ کیا وہ اس کی تحسین وتعریف پر مجبور ہوا۔ ابن خلکان اور علامہ الیافعی فرماتے ہیں کہ "ان کی تفسیر ایک نفیس تفسیر ہے۔
ان تمام باتوں کے ساتھ امام سمعانی زہد وورع میں بھی ممتاز تھے۔ عبدالغافر

۴۷

کہتے ہیں کہ فضل وکمال ہو یا زہد وورع سب میں وہ یکتائے روزگار تھے۔ علامہ السبکی فرماتے ہیں کہ امام موصوف جلیل القدر عالم، زاہد اور متقی تھے۔ آپ کا شمار ان اماماِن وقت میں ہوتا ہے جو اپنے وقت میں اپنے علمی مرتبہ کی وجہ سے غیر معمولی طور معروف ہوئے۔ ذہانت وفطانت سے متعلق امام سمعانی ہی سے یہ قول منقول ہے کہ "میں نے جو چیز ایک بار یاد کر لی پھر کبھی اسے نہ بھولا۔

امام سمعانی کو وعظ ومناظرہ کے میدان میں بھی امامت کا درجہ حاصل تھا۔ علامہ الذہبی فرماتے ہیں کہ "وہ وعظ میں علم کا سمندر معلوم ہوتے تھے۔ علامہ ابوعلی بن الصغار فرماتے ہیں کہ "میں نے جب بھی امام موصوف سے مناظرہ کیا تو مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ائمہ تابعین میں کسی نے مناظرہ کر رہا ہوں کیونکہ ان کے اندر صالحین کی علامات کا مشاہدہ کرتا تھا۔ یہ امام سمعانی کے حالات اور ان کی صفات تھیں جن کو ان کے معاصر اور بعد کے علماء نے بیان کیا ہے۔ ان کے پوتے فرماتے ہیں کہ "ہمارے دادا یکتائے روزگار عالم تھے ان کی ساری خوبیوں کو بیان کرنا ممکن نہیں ہے اس کا اندازہ ان کی تصانیف سے ہر شخص کو ہوسکتا ہے۔ طاش کبری زادہ فرماتے ہیں کہ "امام سمعانی ایک عظیم المرتبت شخص اور مشہور عالم تھے ان کا نام ہمیشہ باقی رہے گا۔

ماخذومراجع

۱۔ ابن الاثیر: علی بن محمد بن محمد عزالدین ابوالحسن۔ (ا) الکامل فی التاریخ ط۔ دارالکتاب العربی، بیروت ط۔ ۵۔

(ب) اللباب فی تہذیب الانساب ط۔ دار صادر بیروت۔

۲۔ الاسنوی: عبدالرحیم جمال الدین الاسنوی: طبقات الشافعیۃ۔ تحقیق: عبداللہ الجبوری ط۔ الارشاد۔ بغداد ۱۹۸۰ء

۳۔ البخاری الامام: محمد بن اسماعیل بن ابراہیم ابوعبداللہ الامام البخاری ط۔ المکتبۃ الاسلامیۃ۔ استانبول۔

۴۔ البغدادی: اسماعیل باشا۔ ہدیۃ العارفین فی اسماء المؤلفین وآثار المصنفین ط۔ مکتبۃ المثنی بیروت۔ طبع استانبول ۱۹۵۵ء۔

۵۔ البغوی: الحسین بن مسعود بن محمد ابومحمد معالم التنزیل ط۔ مصطفی البابی الحلبی ط۔ ۲۔ مصر۔

۶۔ بروکلمان: کارل بروکلمان: تاریخ الادب العربی ط۔ دارالمعارف مصر۔

۷۔ ابن تغری بردی: یوسف بن تغری بردی الاتابکی جمال الدین ابوالمحاسن النجوم الزاہرۃ فی ملوک مصر و
۲۷۱

القاہرۃ ط۔ وزارۃ الثقافۃ ۔ المؤسسۃ المصریۃ العامۃ۔

۸۔ ابن الجوزی: عبدالرحمٰن بن علی بن الجوزی۔ المنتظم فی تاریخ الملوک والامم ط۔ دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد ۔ الہند۔

۹۔ حاجی خلیفہ: مصطفی بن عبداللہ الرومی الشہیر بالملا کاتب ۔کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون ۔ ط۔مکتبۃ المثنیٰ، بیروت ۔

۱۰۔حسنین: عبدالمنعم حسنین۔ الدکتور۔ دولۃ السلاجقۃ۔ ط۔مکتبۃ الانجلو المصریۃ ۱۹۷۵م

۱۱۔ الخالدی: فاضل الخالدی۔ الحیاۃ السیاسیۃ ونظم الحکم فی العراق ط۔مطبعۃ الایمان بغداد ۔

۱۲۔ خطیب البغدادی: احمد بن علی ابوبکر الخطیب ۔تاریخ بغداد ط۔ دار الکتاب العربی۔ بیروت۔

۱۳۔ ابن خلکان: احمد بن محمد بن ابی بکر ابو العباس شمس الدین: وفیات الاعیان وانباء ابناء الزمان۔ تحقیق د۔ احسان عباس ط۔ دار الصادر، بیروت۔

۱۴۔ ال دی: محمد بن علی بن احمد شمس الدین الحافظ طبقات المفسرین ط۔ دار الکتب العلمیۃ بیروت ط۔ ا

۱۵۔ ال ن احمد بن عثمان شمس الدین الامام ۔ (أ) سیر اعلام النبلاء۔ تحقیق: شعیب الارنووط، ط۔ موسسۃ الرسالہ ۔ (ب) العبر فی خبر من غبر۔ تحقیق: فواد سید ط۔ دائرۃ المطبوعات والنشر۔ الکویت ۱۹۶۱ء۔

۱۶۔ الز یر الدین الزرکلی الاعلام۔ قاموس تراجم ط۔ دار العلم للملایین ۔ بیروت ط۶۔

۱۷۔ السبکی: عبدالوہاب بن تقی الدین ابو النصر تاج الدین۔ طبقات الشافعیہ الکبری۔ تحقیق: محمود محمد الطناحی، عبدالفتاح ۔ ط۔مطبعۃ عیسی البابی الحلبی ۔مصر۔

۱۸۔ السمعانی: عبدالکریم بن محمد بن منصور ابو سعد: (أ) التحبیر فی المعجم الکبیر تحقیق: منیرہ ناجی سالم۔ ط۔مطبعۃ الارشاد۔ بغداد ۱۳۹۵م۔ (ب) کتاب الانساب ط۔مجلس دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد الہند۔

السمعانی: منصور بن محمد بن عبدالجبار ۔ (أ) تفسیر السمعانی: نسخۃ مصورۃ من المخطوط المحفوظ فی مکتبۃ جامعہ الازہر بمصر، برقم ۲۰۹۵ تفسیر۔ (ب) نسخۃ مصورۃ من المخطوط المحفوظ فی مکتبۃ دار الکتب المصریہ رقم الایداع ۱۳۶ تفسیر۔

۱۹۔ الشیبانی: احمد بن محمد بن حنبل الامام۔ المسند ط۔ دار صادر۔ بیروت

۲۰۔ الصفدی: صلاح الدین بن خلیل عبداللہ۔ نکت الہمیان فی نکت العمیان ط مطبعۃ الجمالیۃ بمصر ۱۲۹۹م۔

۲۱۔ الصفدی: صلاح الدین بن خلیل بن عبداللہ۔ الوافی بالوفیات، ط دار النشر فرانز شتایز بقیسبادن

۲۲۔ طاش کبری زادہ: احمد بن مصطفی۔ مفتاح السعادۃ ومصباح السیادۃ، ط۔ دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد الدکن۔ الہند۔

۲۳۔ ابن العماد: عبدالحی بن العماد ابو الفلاح۔ شذرات الذہب فی اخبار من ذہب۔ ط۔ مکتبۃ القدس بجوار الازہر۔ ۱۳۵۰ھ۔

۲۴۔ العمری: اکرم ضیاء العمری الدکتور۔ دراسات تاریخیۃ ط۔ الجامعۃ الاسلامیۃ بالمدینۃ المنورہ، ط ۲، ۱۴۰۳ھ۔

۲۵۔ ابن کثیر: اسماعیل بن عمر بن کثیر ابو الفداء عماد الدین۔ البدایۃ والنہایۃ۔ ط دار الکتب العلمیہ، بیروت۔

۲۶۔ کحالۃ: عمر رضا کحالۃ: معجم المؤلفین۔ ط۔ دار احیاء التراث العربی۔ بیروت۔

۲۷۔ الیافعی: عبداللہ بن اسعد بن علی بن سلیمان ابو محمد۔ مرآۃ الجنان وعبرۃ الیقظان۔ ط۔ موسسۃ الاعلمی بیروت۔

۲۸۔ یاقوت الحموی: یاقوت بن عبداللہ ابو عبداللہ الرومی۔ معجم البلدان، ط۔ دار صادر بیروت ۱۳۹۷ھ۔

(الدراسات الاسلامیہ، اسلام آباد، ج ۲۷ شمارہ ۲۔ شوال۔ ذی الحجہ ۱۴۱۲ھ / اپریل۔ جون ۱۹۹۲ء)

مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ

مولانا سید جلال الدین عمری

یہ کتاب اس امر کی بیّن شہادت ہے کہ اسلام کے نظامِ معاشرت پر مصنف کو عبور حاصل ہے۔ اس میں انھوں نے آزادیِ نسواں کے مغربی تصور کی زہرناکی بیان کی ہے۔ اس کے بعد عورتوں کو اسلام نے جو حقوق عطا کیے ہیں ان کی وضاحت ہے۔ پھر ان حقوق پر مسلم اور غیر مسلم دانشوروں کی طرف سے ہونے والے اعتراضات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مہر و نفقہ کا مسئلہ ہو یا طلاق و خلع کا، حجاب کی بحث ہو یا تعدد ازدواج کی، خاندان کی سربراہی کا قضیہ ہو یا ریاست کی قیادت کا تمام ہی قابلِ ذکر پہلو زیرِ بحث آئے ہیں اور ان میں عورتوں کی مخصوص جسمانی صلاحیت، نفسیاتی تقاضے، معاشی ذمہ داریاں اور عدل و مساوات کے تقاضے تمام ہی پہلوؤں کی رعایت کی گئی ہے۔ اس کی اضافی خوبی اس کا علمی اور استدلالی اسلوب ہے۔ ضرورت ہے کہ ہندی اور انگریزی کے علاوہ ملک کی دیگر علاقائی زبانوں میں بھی اس قیمتی تصنیف کے ترجمے ہوں۔

دوسرا ایڈیشن صفحات ۲۰۰ قیمت ۳۵ روپے

ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی

پان والی کوٹھی، دودھپور، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

خبرنامہ ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی

محمد رضی الاسلام ندوی

دورِ حاضر میں اسلام کی دعوت وتبلیغ کے لیے وسیع اور علمی لٹریچر ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ آج اخلاقی، معاشرتی، معاشی، سیاسی غرض زندگی کے مختلف میدانوں میں بہت سے پیچیدہ مسائل اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ امت مسلمہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ دلائل کے ساتھ واضح کرے کہ اسلام ان مسائل کو حل کرنے کی پوری اہلیت رکھتا ہے، اس پر ہونے والی تنقیدوں کا بھرپور جواب دے اور اس کی حقانیت کو علمی اور فکری سطح پر ثابت کرے۔ اس ضرورت کی تکمیل کے لیے یہ ادارہ قائم کیا گیا تھا۔ اس نے اسلامی موضوعات پر تحقیق کے میدان میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں

ادارہ کے کارکن مختلف اسلامی موضوعات پر جو علمی وتحقیقی کتابیں تیار کرتے ہیں وہ ان کی اشاعت کا بھی اہتمام کرتا ہے۔ اب تک یہاں سے متعدد اہم علمی کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ جن میں مولانا صدرالدین اصلاحی کی معرکۂ اسلام وجاہلیت، مولانا سید جلال الدین عمری کی مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ، اسلام میں خدمتِ خلق کا تصور، اسلام اور مشکلاتِ حیات اور مولانا سلطان احمد اصلاحی کی مشترکہ خاندانی نظام اور اسلام، اور مذہب کا اسلامی تصور خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ادارہ کو باہر کے اصحاب قلم کا تعاون حاصل ہے اس نے ڈاکٹر رؤف اقبال سابق صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی کتاب عہدِ نبوی کے غزوات وسرایا، پروفیسر عبیداللہ فراہی صدر شعبہ عربی لکھنؤ یونیورسٹی کی کتاب تصوف۔ ایک تجزیاتی مطالعہ اور حکیم الطاف احمد اعظمی صدر شعبہ تاریخ طب وسائنس جامعہ ہمدرد نئی دہلی کی کتاب ایمان وعمل کا قرآنی تصور شائع کی ہیں۔ ادارہ کی ان تمام مطبوعات کو ملک وبیرون ملک میں کافی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ادارہ کی جانب سے شائع ہونے والے انگریزی تراجم میں Woman and Islam خصوصیت سے قابل ذکر ہے اس کا ہندی ترجمہ بھی ہوچکا ہے ادارہ کی نئی مطبوعات میں دو کتابیں اہم ہیں۔ ایک مولانا سید جلال الدین عمری کی "صحت ومرض اور اسلامی تعلیمات" اور دوسری پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی شعبہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی "عہدِ نبوی کا نظامِ حکومت"

ادارہ کا ایک شعبہ تصنیفی تربیت کا ہے۔ اس کے تحت دینی درس گاہوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں سے فارغ طلبہ کو تصنیف وتالیف اور ترجمہ کی تربیت دی جاتی ہے۔ دینی وعلمی موضوعات پر وقتاً فوقتاً ادارہ میں توسیعی خطبات منعقد ہوتے ہیں۔ ان پروگراموں میں ادارہ کے افراد کے علاوہ مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ اور دیگر اہل علم بھی شریک ہوتے ہیں۔ اسی طرح ادارہ کے زیر تربیت اسکالرز اور مسلم یونیورسٹی کے بعض باذوق طلبہ "رائٹرس فورم" کے نام سے ایک پروگرام کا انعقاد کرتے ہیں جس میں کسی موضوع پر مقالہ پیش کیا جاتا ہے، پھر اس پر بحث ومباحثہ ہوتا ہے۔ مختلف ملی فورموں اور مجالس مذاکرہ اور سمیناروں میں ادارہ کے کارکنوں کی شرکت اس کی متنوع سرگرمیوں کا ایک حصہ ہے۔

ادارۂ تحقیق کی جانب سے ۱۹۸۲ء سے ایک سہ ماہی مجلہ "تحقیقات اسلامی" کے نام سے شائع ہو رہا ہے اس کا شمار اسلامیات کے چند معیاری، علمی وتحقیقی مجلات میں ہوتا ہے۔ اس میں شائع ہوئے مقالات کو ملک وبیرون ملک کے علمی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور ان کی اہمیت کے پیش نظر بہت سے مجلات اس کے مقالات کو نقل کرتے ہیں۔ اس مجلہ میں اسلامی فکر کے مختلف گوشوں پر تحقیقی مقالات شائع ہوتے ہیں۔ ادارہ کے کارکنوں کے علاوہ مسلم یونیورسٹی اور دیگر جامعات اور تعلیمی اداروں کے اصحاب قلم کا بھی اسے بھرپور تعاون حاصل ہے۔

ادارہ کے سامنے اسلامی تہذیب ومعاشرت کے مختلف پہلوؤں پر تصنیف وتالیف کا ایک وسیع منصوبہ ہے۔ "خاندان۔ اسلامی تعلیمات میں"، "والدین کے حقوق وفرائض"، "کمزور طبقات کے مسائل اور ان کا اسلامی حل" کے عناوین پر مولانا سید جلال الدین عمری کی کتابیں زیر ترتیب ہیں۔ ان کتابوں کے متعدد ابواب مختلف مجلات میں شائع ہو چکے ہیں۔ مولانا سلطان احمد اصلاحی کی کتاب "وحدت ادیان کا نظریہ اور اسلام" کتابت کے مرحلہ میں ہے۔ اس وقت مولانا عمری غیر مسلموں سے تعلقات اور اسلام (ملکی حالات کے پس منظر میں) کے موضوع پر اور مولانا اصلاحی "آزادی فکر ونظر اور اسلام" کے موضوع پر کام کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر منور حسین فلاحی مولانا جلال الدین عمری کے کاموں میں علمی معاونت کے ساتھ "اسلام میں کفر اور کافر کا تصور" کے موضوع پر تیاری کر رہے ہیں۔ راقم سطور نے مولانا جلیل احسن ندوی کے مجموعہ ہائے احادیث کی از سر نو ترتیب اور تخریج کی ہے اور اس وقت "اہل کتاب

قرآن اور مسلمان" کے موضوع پر کام کر رہا ہے۔ مولانا محمد جرجیس کریمی جنھوں نے اسی ادارہ سے تصنیفی تربیت حاصل کی ہے۔ قرآن اور مستشرقین پر اپنا کام مکمل کر چکے ہیں اور "انسان اور اس کی نفسیات — قرآن اور حدیث کی روشنی میں" کے موضوع پر کام کر رہے ہیں۔

گذشتہ دنوں ادارہ کے کارکنوں کی بعض کتابیں دوسرے اداروں سے بھی شائع ہوئی ہیں۔ مولانا سید جلال الدین عمری کے منتخب مضامین کا مجموعہ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی نے "یہ ملک کدھر جا رہا ہے؟" کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس کا ہندی ترجمہ بھی چھپ گیا ہے۔ مولانا کی ایک قدیم کتاب "انسان اور اس کے مسائل" جس میں اسلام کا عام فہم اور موثر تعارف کرایا گیا ہے۔ اس کا نیا ایڈیشن چھپ گیا ہے۔ اس کا ہندی ترجمہ مدھر سندیش سنگم نے شائع کیا ہے۔ اب اس کا انگریزی ترجمہ بھی ہو رہا ہے۔ راقم نے حسن البنا شہیدؒ کے رسالہ مقدمات فی علم التفسیر کا "علم تفسیر — چند بنیادی مسائل" کے نام سے ترجمہ کیا ہے۔ اسے مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی نے شائع کیا ہے۔

ادارہ اس وقت جن چند کوارٹرس میں قائم ہے وہ اس کی موجودہ ضروریات کے لیے ناکافی ہیں۔ اس لیے اس کے ذمہ داروں نے اپنے محدود وسائل کے باوجود اللہ کے بھروسے اور اصحابِ خیر کے فراخدلانہ تعاون کی امید پر ایک بڑے کمپلکس کا پروجیکٹ تیار کیا ہے اور مسلم یونیورسٹی میڈیکل کالج کے قریب ایک قطعۂ آراضی پر تعمیر کے کام کا آغاز کر دیا ہے۔ اس دور میں ایسے کاموں کی اہمیت کے پیش نظر امت کے باشعور اور دردمند افراد کو اس ادارہ کی طرف خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

ستمبر ۱۹۹۴ء میں نعمت سائنس اکیڈمی مدراس کے زیر اہتمام "مذہب اور طب" کے موضوع پر یک روزہ نیشنل سمینار منعقد ہوا۔ اس میں یونانی، سدھا، ایلوپیتھی سب ہی طریقہائے علاج سے تعلق رکھنے والے اطبا شریک تھے۔ اس سمینار کے تقسیم ایوارڈ کے اجلاس میں سکریٹری ادارہ مولانا سید جلال الدین عمری کی نئی تصنیف "صحت و مرض اور اسلامی تعلیمات" کی تقریب رونمائی عمل میں آئی۔ ڈپٹی منسٹر برائے صحت جناب پابن سنگھ گھٹوار نے اس کا اجرا کیا اور نواب آف آرکاٹ جناب محمد عبدالعلی عظیم جاہ نے اس کی کاپی حاصل کی۔ اس موقع پر کتاب کا جو مختصر تعارف پیش کیا گیا اسے اگلے صفحے پر دیا جا رہا ہے۔

۶۷۴

REVIEW OF THE BOOK

صحت و مرض اور اسلامی تعلیمات

The Holy Quran attaches great importance to the code of health and hygiene. Islam has given precise instructions about permissible and the prohibited foods, the mode of dress to wear and the hygienic principles which are essential for a healthy living.

The author, Moulana Syed Jalaludding Umari in this book has made a remarkable contribution by bringing out the scientific approach of Islam towards health and hygiene. The hygienic and economic principles which underline Islamic commands and prohibitions are clearly brought out.

There is a medicine for every ailment such that if a right medicine hits a corresponding ailment, health is restored with the Will of God. The author has divided the book into two chapters. The first chapter deals with health and principles involved in maintaining good health like personal hygiene, diet that is permissiable according to Islam and the mode of eating, drinking, different types of sports, exercies rest and sleep. The second chapter deals with the treatment aspects of the diseased. The various types of treatment are mentioned here and cowardly acts like suicide to escape from pains are explained as being against the principles of Islam. For every disease there is treatment except old age and death. Islam emphasises that death may occur anytime by the Will of Gog and that there is treatment for disease and suffering. The so called spritiual treatment through prayer is not ignored by the author, as the body is greatly influenced by the state of mind. And the psychology of the diseased to be studied and catered according to his state of mind.

The author has made a significant contribution by focussing on the scientific and hygienic approach of Islam in dealing with health and a proper code for a moral, healthy long life. The book beautifully throws light on the Islamic approach to human life that can be read by any reader of any religion be it a Muslim or non-Muslim.

AUTHOR: MOULANA SYED JALALUDDIN UMARI
PAGES : 388 HARD BOUND
PRICE : Rs. 70.00
IDARA-E-TAHQEEQ-Q-TASNEER-E-ISLAMI
PAN WALI KOTHI - DODHPUR ROAD
ALIGARH - 202 002.

Dr. Raziuddin Ahmed
Head of the Department
Unani Aringar Anna
Govt. Hospital of
Indian Medicine,
Madras - 106

فہرست مضامین تحقیقات اسلامی علی گڑھ

جلد ۱۳ شمارہ اول تا چہارم جنوری تا دسمبر ۱۹۹۴ء رجب ۱۴۱۴ھ تا جمادی الثانی ۱۴۱۵ھ

حرف آغاز

مضامین	لکھنے والے	شمارہ	صفحہ
۱۔ غیر مسلموں سے تعلقات اور اسلام (۱)	سید جلال الدین عمری	۱	۵
۲۔ " " (۲)	"	۲	۱۲۵
۳۔ مخالفین سے عدم تعلق کے قرآنی احکام کا پس منظر	"	۳	۲۴۵
۴۔ سلام کی اہمیت اور غیر مسلم کو سلام کا حکم	"	۴	۳۶۵

تحقیق و تنقید

مضامین	لکھنے والے	شمارہ	صفحہ
۱۔ تصوف اور شیعیت (۱)	ڈاکٹر محمد ذکی	۱	۱۶
۲۔ عہد اسلامی کے ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کے ذرائع	ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی	۱	۴۴
۳۔ تصوف اور شیعیت (۲)	ڈاکٹر محمد ذکی	۲	۱۳۸
۴۔ طلب علم سے متعلق ایک روایت کی تحقیق	مولانا غازی عزیر	۳	۲۶۲
۵۔ اموی خلفاء و امراء اور اتباع کتاب و سنت	ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی	۳	۲۷۸
۶۔ برطانوی راج کے خلاف مسلمانانِ ہند کی سیاسی اور علمی جدوجہد	ڈاکٹر اقبال حسین	۴	
۷۔ مسلمانانِ بنی اسرائیل دہلی سلطنت کے عہد میں	پروفیسر اقتدار حسین صدیقی	۴	

بحث و نظر

مضامین	لکھنے والے	شمارہ	صفحہ
۱۔ مولانا فراہی کا مسلک حدیث (۱)	مولانا سلطان احمد اصلاحی	۱	۶۵
۲۔ عہدِ عثمان میں جمع قرآن	ڈاکٹر حافظ محمود اختر	۲	۱۷۲
۳۔ مولانا فراہی کا مسلک حدیث (۲)	مولانا سلطان احمد اصلاحی	۲	۱۹۷
۴۔ عہدِ حاضر میں اجتہاد کی معنویت اور نوعیت	مولانا محمد سعود عالم قاسمی	۳	۳۰۶
۵۔ عہدِ اسلامی کے ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کی درسیات	ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی	۳	۳۱۸
۶۔ ہند اسلامی تہذیب اور تصوف	مولانا محمد سعود عالم قاسمی	۴	

۴۷۸

سیر و سوانح

۱۔ کیا البیرونی سندھی تھے؟	پروفیسر محمد صابر خاں	۲	۲۱۷
۲۔ امام ابوالمظفر سمعانی۔ حیات و خدمات	محمد ثناء اللہ بھٹو / ترجمہ مولانا جرجیس کریمی	۴	

ترجمہ و تلخیص

۱۔ موجودہ دور میں اجتماعی اجتہاد کی اہمیت و ضرورت	العبد خلیل / ترجمہ محمد جرجیس کریمی	۱	۹۳
۲۔ حسن البنا شہید کے سیاسی افکار	ایس زیڈ العابدین / ترجمہ سکندر علی اصلاحی	۳	۳۳۲

نقد و استدراک

۱۔ تصوف اور شیعیت	پروفیسر سید محمد سلیم	۳	۳۵۶

تعارف و تبصرہ

۱۔ بعض عربی کتابوں کے جدید ایڈیشن	جناب عبدالمتین منیری	۲	۲۲۱
۲۔ راستے کی تلاش	ڈاکٹر منور حسین فلاحی	۳	۳۵۸
خبر نامہ ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ	ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی	۲	۲۳۵
" "	"	۴	

فہرست مضمون نگاران سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ

مضمون نگاران	مضامین	شمارہ	صفحہ
۱۔ ڈاکٹر اقبال حسین	برطانوی راج کے خلاف مسلمانان ہند کی سیاسی اور علمی جدوجہد	۴	
۲۔ پروفیسر اقتدار حسین صدیقی	مسلمانان بنی اسرائیل دہلی سلطنت کے عہد میں	۴	
۳۔ سید جلال الدین عمری	اسلام اور غیر مسلموں سے تعلقات (۱)	۱	۵
"	" (۲)	۲	۱۲۵
"	مخالفین سے عدم تعلق کے قرآنی احکام کا پس منظر	۳	۲۴۵
۴۔ ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی	خبر نامہ ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی	۲	۲۳۵
"	"	۴	۱

۵۔ مولانا سکندر علی اصلاحی (مترجم)	حسن البنا شہید کے سیاسی افکار	۳	۳۴۳
۶۔ مولانا سلطان احمد اصلاحی	مولانا فراہی کا مسلک حدیث (۱)	۱	۶۵
"	" " (۲)	۲	۱۹۷
۷۔ ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی	عہد اسلامی کے ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کے ذرائع	۱	۴۴
" "	عہد اسلامی کے ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کی درسیات	۳	۳۱۸
۸۔ عبد المتین منیری	بعض قدیم عربی کتابوں کے جدید ایڈیشن	۲	۲۲۱
۹۔ مولانا غازی عزیر	طلب علم سے متعلق ایک روایت کی تحقیق۔	۳	۲۶۲
۱۰۔ مولانا محمد جرجیس کریمی (مترجم)	موجودہ دور میں اجتماعی اجتہاد کی ضرورت اور اہمیت	۱	۹۴
" "	امام ابو المظفر سمعانی	۴	
۱۱۔ ڈاکٹر محمد ذکی	تصوف اور شیعیت (۱)	۱	۱۹
"	" (۲)	۲	۱۳۸
۱۲۔ مولانا محمد سعود عالم قاسمی	عہد حاضر میں اجتہاد کی معنویت اور نوعیت	۳	۳۰۶
" "	ہند اسلامی تہذیب اور تصوف	۴	
۱۳۔ پروفیسر سید محمد سلیم	تصوف اور شیعیت	۳	۳۵۶
۱۴۔ پروفیسر محمد صابر خاں	کیا البیرونی سندھی تھے؟	۲	۲۱۷
۱۵۔ پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی	اموی خلفاء و امراء اور اتباع کتاب وسنت۔	۳	۲۷۸
۱۶۔ ڈاکٹر حافظ محمود اختر	عہد عثمان میں جمع قرآن	۲	۱۷۲
۱۷۔ مولانا منور حسین فلاحی	راستے کی تلاش (تبصرہ)	۳	۳۵۸